www.cpsglobal.org

الرسالہ

Al-Risala

September 2002 ● No. 310



پختگی نام ہے اس استعداد کا کہ کسی تلخی کے بغیر
ناخوش گوار اور مایوس کن حالات کا مقابلہ کیا جائے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الرسالہ

Al-Risāla

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خان

صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla

1, Nizamuddin West Market, New Delhi-13

Tel. 435 6666, 435 1128

Fax: 435 7333, 435 7980

email: info@goodwordbooks.com

website: www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES

Single copy Rs. 10

One year Rs. 110. Two years Rs. 200

Three years Rs. 300. Five years Rs. 480

Abroad: One year $10/£6 (Air Mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY

IPCI: ISLAMIC VISION

434, Coventry Road, Birmingham B10 0JS

Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577

e-mail: info @ ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY

Al-RISALA FORUM INTERNATIONAL

5801 SW 106th Ave,

Cooper City, FL 33328 U.S.A.

Tel. (954) 4358404, Fax: (954) 4342551

e-mail: kaleem@alrisala.org

Printed and published

by Saniyasnain Khan on behalf of

Al-Markazul Islami, New Delhi.

Printed at Nice Printing Press,

7/10, Parwana Road,

Khureji Khas, Delhi-110 051

الرسالہ، ستمبر 2002

فہرست

نمازِ استسقاء

بارش کا موسم گزرتا جارہا ہے اور بارش نہیں ہورہی ہے۔ یہ ایک بے حد سنگین صورت حال ہے۔ پانی ہماری ضرورتوں میں سے سب سے اہم ضرورت ہے۔ زندگی کی تمام ضرورتیں پانی سے وابستہ ہیں۔ اس وقت ملک کے بیشتر حصوں میں بارش کے نہ ہونے یا کم ہونے کی وجہ سے قحط اور سوکھے کی صورت حال پیدا ہوگئی ہے۔ تمام لوگ سخت پریشان ہیں۔

یہ صورت حال خدا کا عذاب نہیں ہے، یہ خدا کی تنبیہہ ہے۔ تنبیہہ اس لئے آتی ہے تاکہ انسان دوبارہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوں۔ لوگ دوبارہ اپنی زندگیوں کو درست کریں۔ وہ سرکشی کی زندگی کو چھوڑ کر اطاعت کی زندگی اختیار کریں۔

اس طرح کے قحط اور سوکھے کے لئے اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ لوگ بڑی تعداد میں اپنے گھروں سے نکل کر باہر اکٹھا ہوں اور دو رکعت نماز پڑھ کر بارش کے لئے دعا کریں۔ اس طرح کی نماز کو شریعت میں صلوۃ الاستقاء یا نماز استسقاء کہا گیا ہے۔ اب آخری وقت آگیا ہے کہ مسلمان ملک کے مختلف مقامات پر جمع ہو کر استسقاء کی نماز پڑھیں تاکہ اللہ کی رحمت متوجہ ہو۔ اللہ تعالیٰ ہمارے اوپر بارش بھیجے اور ہماری زمین کو سیراب فرمائے۔

حدیث کی کتابوں میں کثرت سے استسقاء کی حدیثیں آئی ہیں۔ مثلاً صحیح البخاری میں کتاب الاستسقاء کے تحت بتایا گیا ہے کہ عرب میں سوکھا پڑا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعت صلوۃ الاستسقاء پڑھ کر دعا فرمائی۔ نماز سے پہلے آسمان میں بادل کا کوئی نشان نہ تھا۔ مگر نماز کے بعد آسمان میں بادل آگئے اور اتنی بارش ہوئی کہ لوگ سیراب ہو گئے۔

تاریخ کے ہر دور میں اہل اسلام استسقاء کی نمازیں پڑھتے رہے ہیں۔ واقعات بتاتے ہیں کہ جب بھی استسقاء کی نماز پڑھی گئی اس کے بعد ہی بارش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ استسقاء کی نماز اسلام میں ایک مسلّمہ عبادت ہے اور یہ ایک ایسی عبادت ہے جس کا اجر فوری بارش کی

صورت میں اسی دنیا میں شروع ہو جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں تاریخ میں بعض بڑے عجیب واقعات نقل کئے گئے ہیں۔ مثلاً مؤرخ ابن اثیر نے اپنی کتاب ''الکامل فی التاریخ'' میں ایک واقعہ لکھا ہے جو نہایت سبق آموز ہے۔ اندلس کے سلطان عبد الرحمٰن الناصر کے زمانہ میں وہاں قحط پڑا۔ پانی کی کمی کی وجہ سے لوگ بے حد پریشان ہو گئے۔ اس کے بعد لوگ اپنے گھروں سے نکلے تاکہ میدان میں اکٹھا ہو کر استسقاء کی نماز پڑھیں۔ اس وقت اندلس میں ایک بزرگ اور عالم رہتے تھے جن کا نام قاضی منذر بن سعید البلوطی (وفات ۳۵۵ھ) تھا۔ سلطان نے اپنے ایک آدمی کو قاضی منذر کے پاس بھیجا اور کہلایا کہ قاضی منذر بھی میدان میں آکر لوگوں کے ساتھ استسقاء کی نماز پڑھیں۔ قاضی منذر نے سلطان کے آدمی سے کہا کہ سلطان نے میرے پاس یہ پیغام بھیجا ہے اور خود سلطان کیا کر رہے ہیں۔ آدمی نے کہا کہ میں نے سلطان کو آج سے زیادہ کبھی اللہ سے ڈرنے والا نہیں دیکھا۔ سلطان نے شاہی کپڑے اتار کر معمولی کپڑا پہن لیا ہے اور تخت سے اتر کر زمین پر سجدے میں گر پڑے ہیں اور رو کر یہ دعا کر رہے ہیں کہ اے اللہ میری پیشانی تیرے ہاتھ میں ہے کیا تو میرے گناہوں کی وجہ سے عام لوگوں کو سزا دے گا۔ سلطان کے آدمی نے جب یہ خبر بتائی تو قاضی منذر نے کہا کہ اے شخص بارش کے ساتھ واپس جا کیوں کہ اللہ نے ہمارے لئے بارش کا حکم دے دیا ہے۔ جب دنیا کا بادشاہ عاجزی کرتا ہے تو آسمان کا بادشاہ ضرور رحم فرماتا ہے (إذا خشع جبار الأرض رحم جبّار السماء) جلد ۸، ۶۷۵

استسقاء کی نماز بلاشبہہ بارش کی ایک کلید ہے جو اللہ اور رسول نے ہمیں عطا فرمائی ہے۔ اس سلسلہ میں میں اپنا ایک ذاتی تجربہ یہاں نقل کروں گا۔ غالباً ۱۹۴۰ کی بات ہے۔ اعظم گڈھ کے علاقہ میں سخت خشک سالی ہوئی۔ برسات کا موسم گزرتا جا رہا تھا۔ کسان روزانہ صبح اٹھتے ہی آسمان کی طرف دیکھتے تھے۔ مگر بادل کا ایک ٹکڑا بھی کہیں نظر نہ آتا تھا۔ آخر کار جب مایوسی حد کو پہنچ گئی تو یہ تحریک ہوئی کہ استسقاء کی نماز پڑھی جائے۔ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر سے تقریباً دو کلو میٹر دور ایک میدان میں مدرسہ کے طلبہ اور اساتذہ اور اطراف کی بستیوں کے مسلمان جمع ہوئے۔

مرحوم مولانا محمد سعید صاحب جو اس وقت مدرسۃ الاصلاح میں استاذ تھے اور جن سے میں نے حدیث پڑھی تھی، انہوں نے استسقاء کی نماز پڑھائی اور آخر میں بارش کے لئے دعا کی۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے، ہم لوگ سخت چلچلاتی دھوپ میں سفر کر کے وہاں پہنچے تھے اور اس حال میں نماز ادا کی تھی کہ جسم پسینہ سے شرابور ہو رہا تھا۔ مگر نماز سے فارغ ہو کر جب ہم لوگ واپس ہوئے تو راستہ ہی میں بارش شروع ہوگئی۔ کچھ لوگوں نے درختوں کے نیچے پناہ لی اور کچھ بھیگتے ہوئے اپنے گھروں کو بھاگے۔ (الرسالہ، ستمبر ۲۰۰۲، صفحہ ٦٦)

اس میں کوئی شک نہیں کہ آج ملک میں بڑے پیمانہ پر سوکھے کے حالات پیدا ہو گئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ میری طرح بہت سے دردمند اللہ کے بندے ہوں گے جو اپنی انفرادی عبادتوں میں بارش کہ لئے دعا کر رہے ہوں گے۔ مگر جب مصیبت اجتماعی ہو تو اس وقت اجتماعی دعا کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب آخری وقت آ گیا ہے کہ مسلمان ملک میں جگہ جگہ اکٹھا ہو کر استسقاء کی نماز پڑھیں۔ وہ اجتماعی طور پر بارش کے لئے دعا کریں۔ تقریباً یقین کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر بڑے پیمانہ پر ایسا کیا جائے تو ضرور بارش ہوگی اور سوکھی زمین سیراب ہو جائے گی۔

یہاں میں اضافہ کروں گا کہ اس نماز استسقاء میں بڑی بڑی سیاسی شخصیتوں اور اعلیٰ حکومتی ذمہ داروں کو بھی ضرور بلایا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ لوگ بھی ضرور اس میں شرکت کریں گے۔ قاضی منذر کے مذکورہ قول کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر استسقاء کی اس دعا میں اعلیٰ حکمراں افراد شرکت کریں تو دعا کی قبولیت مزید یقینی ہو جائے گی۔ لوگ نماز اور دعا سے فارغ ہو کر اپنے گھروں کو لوٹیں گے تو انشاء اللہ یہ یقینی ہے کہ باران رحمت کا نزول ہو چکا ہوگا۔ (۲۳ جولائی، ۲۰۰۲)

برطانیہ کا سفر

گلوبل کراس روڈس (Global Crossroads) کے زیر اہتمام لندن میں ایک انٹرنیشنل کانفرنس ہوئی۔ اس کے دعوت نامہ پر دہلی سے برطانیہ کا سفر ہوا۔ اس سلسلہ میں لندن اور برمنگھم اور مانچسٹر میں کچھ وقت گذرا۔ یہ سفر ۱۶ ستمبر ۲۰۰۱ کو شروع ہوا اور ۲۶ ستمبر کو ختم ہوا۔

۱۶ ستمبر کی رات کو میں دہلی ہوائی اڈہ پر پہنچا۔ آج یہاں غیر معمولی بھیڑ تھی۔ مگر یہ بھیڑ مسافروں کی نہ تھی۔ اس میں بڑی تعداد یا تو پولس والوں کی تھی یا ان مردوں اور عورتوں اور بچوں کی جو اپنے عزیزوں کو پہنچانے کے لیے یہاں آئے تھے۔ آج ائر پورٹ پر چکنگ کا کام بہت زیادہ بڑھا دیا گیا تھا۔ حتی کہ چیکنگ اور سیکورٹی کے غیر معمولی انتظام کی بنا پر جہاز ایک گھنٹہ لیٹ ہو کر دہلی سے روانہ ہوا۔

ائر پورٹ پر یہ غیر معمولی صورت حال ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ کے واقعہ کی بنا پر تھی جو امریکہ کے دو شہر نیویارک اور واشنگٹن میں پیش آیا۔ اس دن ہائی جیکنگ کا ایک نیا واقعہ ہوا جس کو ہائی اٹیکنگ کہا جا سکتا ہے۔ کچھ لوگوں نے امریکہ کے چار جہازوں کو ہائی جیک کر لیا اور اس کو اڑاتے ہوئے لے جا کر نیویارک اور واشنگٹن میں وہاں کی اونچی عمارتوں سے ٹکرا دیا۔ اس واقعہ کی کافی تفصیل میڈیا میں آچکی ہے۔

آج اس مسئلہ پر میرا ایک انٹرویو انگریزی روزنامہ ٹائمس آف انڈیا (۱۶ ستمبر ۲۰۰۱) میں شائع ہوا جس کے ساتھ میری تصویر بھی شامل تھی۔ اس انٹرویو کا عنوان تھا ــــ امریکی حملہ کا نتیجہ الٹا ہوگا:

US aggression would be counter productive

اس انٹرویو میں میں نے مختلف باتیں بتاتے ہوئے کہا تھا کہ اس واقعہ نے یہ ثابت کیا ہے کہ نفرت کا بم تمام بموں سے زیادہ خطرناک ہے۔ وہ اتنا طاقتور ہے کہ کوئی سپر پاور بھی اس سے محفوظ نہیں۔ یہ انٹرویو ان الفاظ پر ختم ہوا تھا ــــ نفرت ایک سپر بم ہے جس سے امریکہ بھی نمٹ نہیں سکتا:

Hatred is a super bomb which even America can't handle.

کچھ مسافروں نے آج کے باتصویر انٹرویو کو پڑھا تھا چنانچہ فطری طور پر وہ بعض لوگوں سے

گفتگو کا موضوع بن گیا۔ ایک مسلمان مسافر جو امریکہ کے مخالف تھے اُن سے میں نے کہا کہ امریکی رپورٹ کے مطابق، ۱۱ ستمبر کا یہ واقعہ مسلمانوں نے انجام دیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس وقت مختلف ملکوں کے مسلمان ۶ ملین سے بھی زیادہ تعداد میں امریکہ میں رہتے ہیں۔ میں بارہ بار امریکہ گیا ہوں اور میں نے دیکھا ہے کہ وہاں یہ مسلمان کسی بھی مسلم ملک سے زیادہ اچھی حالت میں رہتے ہیں۔ گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ خود مذکورہ مسافر کے کچھ قریبی عزیز امریکہ میں رہ رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ ایسی حالت میں آپ لوگ کیوں امریکہ سے نفرت کرتے ہیں۔ اس طرح کی اور کئی باتیں میں نے کہیں جن کا جواب دلیل کی زبان میں ان کے پاس نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے بے دلیل ہو کر کہا کہ اس معاملہ میں میرے جذبات میری منطق پر حاوی ہو گئے ہیں:

My sentiments have overtaken my logic.

میں نے نہایت دکھ کے ساتھ کہا کہ آج کل کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ جب امریکہ پر قومی تبصرہ کرنا ہو تو وہ اپنی منطق کو پیچھے کر لیتے ہیں اور جذبات کو آگے۔ مگر یہی مسلمان اس وقت اپنی منطق کو آگے اور جذبات کو پیچھے کر لیتے ہیں جب کہ اُنہیں اپنی اولاد کو امریکہ میں بھیجنے کا کوئی چانس مل گیا ہو۔

میں ائرپورٹ کے ریسٹورنٹ میں بیٹھا ہوا تھا۔ دیوار پر لگے ہوئے ٹی وی پر پروگرام آرہے تھے۔ یہ پروگرام زیادہ تر امریکہ میں ہونے والے ۱۱ ستمبر کے حادثہ سے متعلق تھے۔ ایک اسپیکر نے بولتے ہوئے کہا کہ اسامہ بن لادن اور ان کے جیسے دوسرے لوگ امریکہ کے مقابلہ میں مادی اعتبار سے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ مگر جو لوگ موت سے نہ ڈرتے ہوں وہ اتنا دلیر ہو جاتے ہیں کہ اُن کو کسی بھی چیز سے ڈرایا نہیں جا سکتا، یہی ان کی سب سے بڑی طاقت ہے:

Those who have no fear of death
cannot be frightened with anything.

دہلی سے لندن کے لئے برٹش ائرویز کی فلائٹ نمبر ۱۴۲ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ اس کی پرواز کا وقت رات کے دو بجے تھا۔ مگر ایرپورٹ پر غیر معمولی چیکنگ اور قدم قدم پر سیکورٹی کی وجہ سے جہاز ایک گھنٹہ لیٹ ہو کر روانہ ہوا۔ اس بار میری سیٹ جہاز کے اوپر کے حصہ ڈیک (deck) میں تھی۔

اس تجربہ سے اندازہ ہوا کہ ڈیک کا سفر بہت پرسکون ہوتا ہے۔ دہلی میں جب میں کاؤنٹر پر اپنا بورڈنگ کارڈ لے رہا تھا تو کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے ہوئے آدمی نے کہا کہ ہم آپ کو ڈیک میں سیٹ دے رہے ہیں، کیا یہ ٹھیک ہے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کا مشورہ اس سلسلہ میں کیا ہوگا، اس نے کہا:

I love travelling in the deck.

راستہ میں ایک ہندو اسکالر سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران انہوں نے کہا کہ آپ لوگ ہندوؤں کو بت پرست سمجھتے ہیں مگر خود آپ لوگ بھی بت پرست ہیں۔ میں نے پوچھا کہ وہ کس طرح۔ انہوں نے کہا کہ ہندو کی بت پرستی یہ ہے کہ انہوں نے خدا کو جسمانی روپ دے کر مختلف بت بنا لئے اور ان کو پوجنے لگے۔ مسلمانوں نے یہ کیا کہ انہوں نے خود خدا ہی کو بت بنا لیا۔ خدا تو سرتاپا نراکار ہے، یعنی ہماری طرح اس کا کوئی متشخص وجود نہیں۔ مگر مسلمانوں نے پرسنل گاڈ کا تصور قائم کر کے یہ سمجھ لیا کہ خدا انسانی وجود کی طرح علیحدہ اور ایک مستقل وجود ہے اور پھر وہ اس کو پوجنے لگے۔ حالانکہ خدا ہر چیز میں سمائی ہوئی ایک اسپرٹ (pervading spirit) ہے۔

میں نے کہا کہ یہ وہی چیز ہے جس کو عربی زبان میں **بناء الفاسد علی الفاسد** کہتے ہیں۔ آپ نے ایک غلط معیار (criterion) بنایا اور اس غلط معیار پر جانچ کر یہ سمجھ لیا کہ اسلام بھی بت پرستی سکھاتا ہے۔

میں نے کہا کہ مسلمان ایک خدا پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ مگر وہ ایسا نہیں کرتے کہ وہ ایک خدا کا بت بنائیں اور پھر اس بت کو پوجیں۔ بت پرستی یہ ہے کہ خدا کے نام پر غیر خدا کی پرستش کی جائے۔ بت پرستی یہ ہے کہ خدا کے نام پر اس کی ایک ظاہری مورت بنائی جائے اور اس مورت کو خدا کا مظہر سمجھ کر اس کی عبادت کی جائے۔ مگر مسلمان ایسا نہیں کرتے کہ وہ الگ سے خدا کی کوئی فرضی مورت بنائیں۔ بلکہ وہ خود خدا ہی کی براہ راست طور پر تصوراتی عبادت کرتے ہیں۔ اسلام کے مطابق، انسان اور خدا کے درمیان تعلق کے لئے کوئی درمیانی واسطہ نہیں، نہ بت کا اور نہ کسی اور چیز کا۔ مسلمان خدا کے بت کی عبادت نہیں کرتے بلکہ خود خدا کی براہ راست عبادت کرتے ہیں۔ (اس معاملہ میں اسلام کا عقیدہ امام مالک کے الفاظ میں یہ ہے: **الإستواء معلوم والکیف مجهول والسؤال عنه بدعة**)

سفر کے دوران برٹش ایرویز کا فلائٹ میگزین ہائی لائف (High Life) کا شمارہ ستمبر ۲۰۰۱ء دیکھا۔ اُس میں ایک مضمون گفت وشنید (negotiation) کے موضوع پر تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ کامیاب گفت وشنید کا طریقہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں مضمون نگار نے لکھا تھا کہ ـــــ آپ جتنا سمجھتے ہیں اُس سے زیادہ طاقت آپ کے اندر ہے:

You have more power than you think.

مضمون میں بتایا گیا تھا کہ گفت وشنید خود ایک طاقت ہے۔ اس طاقت کو صحیح طور پر استعمال کرنے کے لیے کچھ شرطیں ضروری ہیں۔ ان میں سے ایک شرط مضمون میں یہ بتائی گئی تھی کہ آپ بات چیت کرتے ہوئے یہ جانیں کہ آپ کا مخالف فریق واقعتہً کیا چاہتا ہے:

What your opponent really wants.

اس حقیقت کو جانے بغیر کوئی گفت وشنید کامیاب گفت وشنید نہیں ہوسکتی۔ اس دنیا میں کامیابی کا راز یہ ہے کہ آپ اپنے حریف کی خواہش کو اپنی موافقت میں استعمال کرسکیں۔

ہمارا جہاز لندن ائر پورٹ پر اترا تو اس وقت ستمبر ۲۰۰۱ کی ۱۷ تاریخ تھی اور مقامی اعتبار سے صبح کے ۸ بجے کا وقت۔ کچھ دیر ائر پورٹ پر قیام کرنے کے بعد بذریعہ روڈ آگے کے لئے روانگی ہوئی۔ تقریباً دو گھنٹہ سفر کرنے کے بعد میں ایش ڈاؤن پارک ہوٹل پہنچا۔ کانفرنس کے دوران میرا قیام اسی ہوٹل کے کمرہ نمبر ۶۶ میں تھا۔ کانفرنس کی کارروائیاں بھی اسی ہوٹل کے ہال میں ہوئیں۔ ۲۰ ستمبر ۲۰۰۱ تک میرا قیام اس ہوٹل میں رہا اس کے بعد یہاں سے بذریعہ روڈ برمنگھم اور مانچسٹر گیا۔

ایش ڈاؤن پارک ہوٹل ۱۸۶ ایکڑ کے رقبہ میں واقع ہے۔ اس کے چاروں طرف دور دور تک سرسبز علاقے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی تاریخ یہ ہے کہ ۱۸۶۷ میں ایک بڑے جاگیردار نے اس کو مینر ہاؤس (Manor House) کے طور پر بنایا تھا۔ ہندستانی اصطلاح میں اس کو ایک بڑا فارم ہاؤس کہہ سکتے ہیں۔ مختلف بلڈنگوں کے علاوہ اس میں ایک بڑا چرچ بھی بنایا گیا تھا۔ یہ مقام مختلف مقاصد کے لئے استعمال ہوتا رہا یہاں تک کہ ۱۹۹۳ میں اس کو ایک لگذری ہوٹل میں تبدیل کردیا گیا۔ اس کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس کا عماراتی ڈھانچہ مکمل طور پر اپنی قدیم حالت میں باقی رکھا گیا ہے۔ اسی کے

ساتھ اس کی تزئین وتجدید کرکے اس کو پورے معنوں میں جدید ہوٹل کا نمونہ بنادیا گیا ہے۔

یہ کانفرنس دراصل ایک گلوبل ڈائیلاگ کے طور پر کی گئی تھی۔ اس کا موضوع یہ تھا کہ پرامن دنیا کی تعمیر کس طرح کی جائے۔ اس میں مختلف ملکوں اور مختلف مذہبوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ تین دن تک اس موضوع پر ڈسکشن ہوتا رہا۔ میری تقریر ۱۸ ستمبر کو تھی۔ میں نے اپنی تقریر کے ساتھ موضوع سے متعلق دو پمفلٹ پیش کئے جو اس کانفرنس کے لئے تیار کیے گئے تھے۔ یہ دونوں پمفلٹ کانفرنس کے شرکاء کے درمیان تقسیم کئے گئے۔ ان کے ٹائٹل یہ تھے:

A Manifesto of Peace, Road to Paradise

اس کانفرنس کے اجلاس ۱۸ ستمبر میں میری تقریر تھی۔ جب میں نے لندن میں یہ تقریر کی اُس سے صرف ایک ہفتہ پہلے ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو نیویارک اور واشنگٹن کی اونچی عمارتوں پر حملہ کا واقعہ ہوا تھا جس میں تقریباً چار ہزار آدمی مر گئے۔ میں نے اپنی تقریر میں اس واقعہ کا ذکر کیا تو غم سے میرا دل بھر آیا اور میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اس کانفرنس کے صدر مسٹر آندرے بائیکوف تھے۔ اُنہوں نے اپنی تقریر میں میرا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے درمیان آج ایک ایسا مسلمان ہے جو انسانیت کا درد رکھنے والا ہے اور جو ۱۱ ستمبر کے واقعہ پر اتنا زیادہ دُکھی ہے۔ اس کانفرنس میں میرے سوا ایک اور مسلمان تھے جو باہر کے ایک ملک سے آئے تھے۔ انہوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ یہ صرف ایک مسلمان کی بات نہیں، بلکہ یہ سارے مسلمانوں کی بات ہے۔ دنیا بھر کے تمام مسلمان ۱۱ ستمبر کے واقعہ پر رو رہے ہیں اور چلّا رہے ہیں:

The whole Muslim world is weeping and crying.

اجلاس کے بعد کھانے کی میز پر مذکورہ مسلمان سے میری ملاقات ہوئی۔ میں نے اُن سے کہا کہ میں بھی اسی مسلم دنیا میں رہتا ہوں، میں نے تو کسی مسلمان کو امریکہ کے اس واقعہ پر روتے اور چلّاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ آخر یہ آپ کس مسلم دنیا کی بات کر رہے ہیں۔ انہوں نے مسکرا کر جواب دیا کہ امریکہ بہت چودھرائی کر رہا تھا، اُس کو سبق دینا تو ضروری تھا۔

یہ واقعہ بڑا عبرت انگیز ہے۔ غیر حقیقت پسندانہ روش آدمی کو منافق بنادیتی ہے۔ غیر حقیقت پسندانہ

Speech at London Conference

I am thankful to the organizers of this conference for giving me the opportunity to attend this international meeting and share my views with this learned audience. We started our journey of peace from Switzerland, and now London is our next station. In Switzerland we have successfully identified the basic problems faced by the world of today.

The joint declaration at the Swiss City of Zug rightly pointed out the first step in this regard. It called for building a better world, based on moral and spiritual values. It was also emphasized that, the beginning of this process involves the elimination of nuclear weapons. Only then, can peace be established in our world. It is a fact that, no constructive work can be effectively performed without the establishment of peace. Peace is must for all kinds of progress and development.

One aspect of the deliberations at Switzerland was that it emphasized the importance of ideology for coping with violence. Violence always begins in the mind, so we have to uproot it from the mind itself. We have to find an ideology of peace as against an ideology of violence. Otherwise there will be no end to violence. The horrible events in New York and Washington on September 11, 2001 have only affirmed this point. This event has proved that, with a violent bent of mind man can wage a war even without arms. He can bombard without a bomb. Therefore we have to eradicate the

violent way of thinking and inculcate instead a peaceful way of thinking.

In view of this fact, and in the spirit of the Zug declaration, I have prepared two pamphlets titled, A Manifesto of Peace, and Road to Paradise. This is my humble contribution to this universal mission. The first book describes the importance of external peace. And the second book describes the importance of internal peace. Both are essential for a smooth and balanced development.

Now, in a few words, I would like to say some words on the present team: This team of concerned people, organized under the dynamic leadership of Mr. Andrey Bykov seems to be a minority group at present, but being a small group or a minority group is not a minus point. As Schumacher has rightly said, "Small is beautiful." And the British Historian Arnold Toynbee, after a life long study of history tells us that, those minorities who proved to be creative minorities actualized the great revolutions of human history. And I hope that this team will stand the test of being a creative minority and will succeed in bringing about the revolution the world has been waiting for so long.

In the end, I would like to say that the formula of revolution is very simple:

Change yourself and you will be able to change the whole world.

May God help you to realize this noble cause.

Nuclear Disarmament Forum, Ashdown Park, London
September 14, 2001

سوچ اس قابل نہیں ہوتی کہ آدمی اُس کو دوسروں کے سامنے مدلّل کر سکے۔ ایسی بات آدمی کو خود تو اچھی لگتی ہے مگر وہ اسٹیج پر کہنے کے قابل نہیں ہوتی۔ اُس کو دوسروں کے سامنے بیان کرنا اپنے آپ کو حقیر بنانے کے ہم معنیٰ ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے دل میں کچھ ہوتا ہے مگر دوسروں سے وہ کچھ اور بیان کرتا ہے۔ وہ یقولون بأفواههم ما ليس في قلوبهم (آل عمران ۱۶۷) کا مصداق بن جاتا ہے۔ نجی گفتگو میں وہ ایک زبان بولتا ہے اور عوام کے سامنے گفتگو میں دوسری زبان۔

لندن کی اس کانفرنس میں ڈاکٹر ایل ایم سنگھوی بھی شریک تھے۔ وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص ہیں۔ وہ اس سے پہلے لندن میں ہندستان کے ہائی کمشنر رہ چکے ہیں۔

کانفرنس کے موقع پر میرا پمفلٹ مینی فیسٹو آف پیس (Manifesto of Peace) شرکاء کے درمیان تقسیم کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر سنگھوی نے اس کو پڑھا اور اس کے بارے میں اپنے اعلیٰ تاثرات کا اظہار کیا۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر سنگھوی نے میری اور بھی بعض کتابیں پڑھی ہیں۔ مثلاً ٹرو جہاد (The True Jihad)۔ واپسی کے بعد انہوں نے اپنے خط (۳ مئی ۲۰۰۲ء) میں اپنا تاثر ان الفاظ میں لکھ کر مجھے بھیجا:

May 3, 2002

My Dear Maulana Saheb,

I have received a copy of the True Jihad. It is a mirror in which I see your visage and read your message of peace, tolerance and non-violence. I read in your message the words of wisdom which are our common heritage. I hear the resonant voice of the Mahatma in the words of the Maulana!

With my deep regards,
Yours ever,
L. M. Singhvi.

ہوٹل میں لندن کے انگریزی روزنامہ دی ٹائمس (The Times) کا شمارہ ۱۹ ستمبر ۲۰۰۱ دیکھا۔ اس کے صفحۂ اول پر زیادہ تر موجودہ حالات کے تعلق سے مسلم خبریں تھیں۔ ایک پوسٹر کی کافی بڑی تصویر تھی جس کے اوپر لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ لکھا ہوا تھا۔ اس پوسٹر کے نیچے درج تھا کہ "ایک مسلم نوجوان پلے کارڈ لئے ہوئے المہاجرون کے مظاہرہ کے دوران لندن میں پاکستانی ہائی کمیشن کے سامنے":

A boy with a playcard at an al-Muhajirun demonstration outside the Pakistan High Commission in London yesterday.

جو مسلم نوجوان پلے کارڈ لئے ہوئے تھا اس کی ٹوپی پر سامنے لکھا ہوا تھا: لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ پلے کارڈ میں جلی حرفوں میں یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے — امریکہ اسلام کے ساتھ حالت جنگ میں:

USA AT WAR WITH ISLAM

دنیا کا نظام مسابقت کے اصول پر قائم ہے۔ اس لئے یہاں ہمیشہ ایک گروہ اور دوسرے گروہ کے درمیان رقابت اور عداوت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ یہ مسئلہ مسلمانوں کے لئے بھی ہے اور غیر مسلموں کے لئے بھی۔ مگر دونوں کے درمیان ایک فرق ہے۔ غیر مسلم لوگ اس طرح کے مسائل کو صرف ملکی اور قومی عنوان دیتے ہیں۔ مگر مسلمان اس کو فوراً اسلامی عنوان دے دیتے ہیں۔ مثلاً امریکہ نے جاپان پر ایٹم بم گرایا تو وہاں کے لوگوں نے یہ نہیں کہا کہ یہ جاپانی مذہب پر حملہ ہے۔ اسی طرح امریکہ نے ویت نام میں ۱۱ سال تک جنگ جاری رکھی۔ مگر ویت نام کے لوگوں نے یہ نہیں کہا کہ امریکہ ہمارے مذہب کا دشمن ہے اور ہمارے مذہب کو مٹانا چاہتا ہے۔ لیکن مسلمانوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ وہ ہمیشہ اس طرح کے معاملات کو مذہب کا عنوان دے دیتے ہیں۔ پہلے ایک مدت تک وہ انگریز کو اسلام دشمن بتاتے تھے اور اب وہ امریکہ کو اسلام دشمن بتا کر اس سے نفرت اور ٹکراؤ کو دینی جہاد سمجھے ہوئے ہیں۔

اس منفی پالیسی کا سب سے بڑا نقصان خود مسلمانوں کے حصہ میں آیا ہے۔ اسلام کی سب سے بڑی طاقت دعوتی عمل میں ہے۔ مگر اس غیر واقعی پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں دعوتی عمل کا جذبہ ختم ہوگیا۔ دعوتی عمل ہمیشہ دوسری قوموں سے خیر خواہی کے جذبہ پر قائم ہوتا ہے۔ مگر دوسری قوموں

سے نفرت اور ٹکراؤ کے ماحول کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے اندر دعوت کی نفسیات ہی باقی نہ رہی۔ اور جہاں دعوت کی نفسیات باقی نہ رہے وہاں دعوت کا عمل کیوں کر جاری ہوسکتا ہے۔

برمنگھم جاتے ہوئے کچھ دیر کے لیے لندن ٹھہرا۔ سفر سے واپسی میں بھی کچھ دیر کے لیے لندن میں قیام رہا۔ لندن برطانیہ کی راجدھانی ہے۔ وہ دوسری عالمی جنگ سے پہلے ایک وسیع ایمپائر کا مرکز رہ چکا ہے۔ یہاں جگہ جگہ اس عظیم ماضی کی یادگاریں دکھائی دیتی ہیں۔ وہ اپنی آبادی کے لحاظ سے دنیا کا چھٹا سب سے بڑا شہر ہے۔ انگریزوں کے روایت پسندانہ ذوق کی بنا پر یہاں ماضی کی یادگاریں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ لندن اپنی عمارتوں کے اعتبار سے جدید شہر سے زیادہ ایک قدیم شہر دکھائی دیتا ہے۔ فضائی مشاہدہ میں لندن ایک ایسا شہر نظر آتا ہے جہاں جدید طرز کی بلند عمارتیں بہت کم ہیں۔ زیادہ تر عمارتیں قدیم انداز کی کم بلندی والی دکھائی دیتی ہیں۔ یہاں کی آبادی کافی گھنی ہے، یعنی ایک مربع میل میں بارہ ہزار افراد۔ پھر بھی شہر میں پارک اور کھلے مقامات کافی تعداد میں موجود ہیں۔

لندن کی تاریخ رومن عہد سے شروع ہوتی ہے۔ یہاں اب بھی بہت سے گرجا گھر اور دوسری عمارتیں موجود ہیں جو رومن عہد کی یاد دلاتی ہیں۔ انگریزوں نے اپنی عظمت کو برقرار رکھنے کے لیے بہت سی قدیم زمانہ کی چیزیں ابھی تک باقی رکھی ہیں۔ اُنہی میں سے ایک بی بی سی لندن ہے جو ۱۹۲۷ میں قائم ہوا۔ یہ نشریاتی ادارہ عوامی تعاون (Publicly Financed Corporation) کے طور پر قائم کیا گیا تھا۔ اب بھی وہ اسی اصول پر چل رہا ہے۔ یہ ادارہ بہت سی زبانوں میں خبریں نشر کرتا ہے۔

میرا ارادہ کانفرنس کے بعد سیدھے دہلی واپس آنے کا تھا۔ چنانچہ ۲۱ ستمبر کو واپسی کا رزرویشن کرالیا تھا۔ مگر برمنگھم سے جناب شمشاد محمد خاں صاحب اور مانچسٹر سے العارف احمد (el-Arif A-Ahmed) کے ٹیلی فون آئے۔ ان لوگوں نے اصرار کیا کہ میں چند دن مزید ٹھہر کر برمنگھم اور مانچسٹر کا سفر کروں اور اس کے بعد واپس جاؤں۔ چنانچہ میں نے سابقہ رزرویشن کینسل کردیا اور ۲۰ ستمبر ۲۰۰۱ کی شام کو ایش ڈاؤن پارک ہوٹل (لندن) سے روانہ ہوکر برمنگھم پہنچا۔

تین گھنٹہ کا یہ راستہ نہایت عمدہ سڑک کے ذریعہ طے ہوا۔ سڑک کے دونوں طرف یا تو

خوبصورت مکانات تھے یا سرسبز مناظر۔ مغربی ملکوں کی سڑکیں عام طور پر اسی قسم کی ہوتی ہیں۔ مگر ہندستان میں ابھی تک وہ حال ہے جس کا نقشہ ایک شاعر نے ان الفاظ میں کھینچا ہے:

آگے ہیں قدم پیچھے ہے نظر جانا ہے کہاں جاتے ہیں کدھر

مبہم ہے یہاں خود سمت سفر نیرنگ زمانہ کیا کہئے

برمنگھم میں میرا قیام جناب شمشاد محمد خاں صاحب کی رہائش گاہ پر تھا۔ وہ دعوتی مزاج رکھتے ہیں۔ اور کامیاب طور پر یہاں ایک دعوتی مرکز چلا رہے ہیں جس کا نام اسلامک پروپیگیشن سنٹر انٹرنیشنل (IPCI) ہے۔ یہ سنٹر ایک بڑی بلڈنگ کے اندر واقع ہے۔ اس کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔

اس مرکز کی مختلف سرگرمیوں میں سے ایک یہ ہے کہ ہر گھر میں دعوت کا پیغام پہنچ جائے۔ اس اسکیم کو وہ ڈور ٹو ڈور لیفلٹ ڈراپ (door to door leaflet drop) کہتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے پورے ملک میں وسیع پیمانہ پر ایک منظم جدوجہد جاری ہے۔ اس دعوتی مرکز کی سرگرمیوں کو دیکھنے کے بعد میں نے سوچا کہ غالباً یہی وہ عمل ہے جس کا ذکر حدیث میں اس طرح آیا ہے کہ دنیا کا کوئی چھوٹا یا بڑا گھر نہ ہوگا جس کے اندر اسلام کا کلمہ نہ پہنچ جائے۔ میں نے برادر شمشاد محمد خاں صاحب سے بات کرتے ہوئے کہا کہ کچھ لوگ اس حدیث کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ ساری دنیا میں اسلام کی حکومت قائم ہو جائے گی۔ مگر یہ مذکورہ حدیث کو خود ساختہ طور پر سیاسی مفہوم دینا ہے۔

اس حدیث کا مطلب واضح طور پر کلمۂ اسلام کا ہر گھر میں داخل ہونا ہے، نہ کہ اسلامی اقتدار کا ہر گھر کے اوپر قائم ہونا۔

اسلامک پروپیگیشن سنٹر انٹرنیشنل کے تحت جو کام ہو رہے ہیں اُن میں سے ایک یہ ہے کہ یہ لوگ قرآن کا انگریزی ترجمہ کرکے ممتاز افراد تک پہنچاتے ہیں۔ برادرم شمشاد محمد خاں صاحب نے بہت سے خطوط دکھائے جن میں اسلام کے بارے میں لوگوں کے بہت اچھے تاثرات درج تھے۔ مثلاً ایک انگریزی لارڈ کنگس ڈاؤن (Lord Kings Down) نے اپنے خط مورخہ ۱۵ اکتوبر ۲۰۰۱ میں لکھا:

I have felt for years that I ought to try to study this great work and would be pleased to have the opportunity now at this critical time.

اسی طرح ایک اور ممتاز انگریز لارڈ پریر (Lord Prior) نے اپنے خط مورخہ ۱۹ اکتوبر ۲۰۰۱ء میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سے پہلے مجھے ایک عرب نے قرآن کا ایک خوبصورت نسخہ دیا تھا مگر اس میں ترجمہ شامل نہ تھا اس لیے میں اُس کو پڑھ نہیں سکا تھا:

Although it is a much treasured book, I am unable to read it.

برمنگھم میں رہنے والی ایک مسلم خاتون محترمہ نسیم اختر صاحبہ نے اپنا ایک مجموعہ کلام دیا۔ یہ مجموعہ ۳۲۰ صفحات میں لاہور سے چھپا ہے اور اس کا نام ہے 'درد کا ایک شہر'۔ اس مجموعہ میں محبت و انسانیت اور صوفیانہ تصوارت کی عکاسی نظر آتی ہے۔ مثلاً اس کا ایک شعر یہ تھا:

مجھے ادھورے سفر سے نجات کی خاطر   خود اپنے پاؤں کا کانٹا نکالنا ہوگا

اس شعر میں زندگی کی ایک اہم حقیقت کی ترجمانی کی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب بھی کوئی فرد یا قوم زندگی کے سفر میں پچھڑ جائے تو اس کا سبب دوسروں کی سازش یا عداوت نہیں ہوگی۔ اس کا سبب یقینی طور پر خود اپنی کوتاہیاں ہوں گی۔ ایسی حالت میں اپنی ساری توجہ اپنی کوتاہیوں پر مرکوز کرنا ہوگا۔ دوسروں کی سازش اور کوتاہیوں کا اعلان صرف وقت کے ضیاع کے ہم معنیٰ ہے جس کا نتیجہ اپنی محرومی میں اضافہ کے سوا اور کچھ نہیں۔

برمنگھم میں ایک اور خاتون مسز نجمہ ملاقات کے لئے آئیں۔ وہ یہاں کی مقامی پالیٹکس میں ایک لیڈر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ اُن سے تفصیلی گفتگو ہوئی۔ اُن کو میں نے مشورہ دیا کہ آپ اپنی صلاحیت کو پالیٹکس کے میدان میں استعمال کرنے کے بجائے دعوت کے میدان میں استعمال کریں۔

برمنگھم، آبادی کے اعتبار سے برطانیہ کا دوسرا سب سے بڑا شہر ہے۔ وہ اقتصادی مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اٹھارہویں صدی کے آخر میں برمنگھم صنعتی انقلاب کا مرکز بن گیا۔ لوہے اور انجینئرنگ کی تجارت میں اُس نے نمایاں حیثیت حاصل کرلی۔

برمنگھم کی خوش قسمتی یہ تھی کہ اٹھارہویں صدی کے آخر میں یہاں بہت سے قابل دماغ اکٹھا ہوگئے۔ مثلاً جیمس واٹ (James Watt) اور میتھیو بولٹن (Matthew Boulton) اور ولیم مرداک

(William Murdock) ، وغیرہ۔ ان مفکرین نے ایک سوسائٹی بنائی جس کا نام لیونر سوسائٹی (Luner Society) تھا۔ یہ پورا گروہ ٹیکنیکل ترقیوں سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ اس نے اُس زمانہ کے لوگوں میں جدید مشینی انقلاب کا شعور پیدا کیا۔

بولٹن کی سوہو مینو فیکٹری (Sohomanu factory) جس نے یورپ میں پہلی بار صنعتی ضروریات کے لیے اسٹیم انجن تیار کیا، وہ اسی برمنگھم سے تعلق رکھتی تھی۔ انیسویں صدی میں برمنگھم کو نہایت لائق انتظامیہ ملی جس نے شہر کو بہترین سڑکیں دیں اور دوسرے ترقیاتی وسائل فراہم کیے۔ دوسری عالمی جنگ میں برمنگھم بمباری سے تباہ ہوا مگر بہت جلد وہ دوبارہ زیادہ بہتر طور پر تعمیر کرلیا گیا۔ برمنگھم سے لندن تک ریلوے لائن ۱۸۳۸ میں مکمل ہوئی۔ اس کے ۶۳ سال بعد ۱۹۰۱ میں ہمارے ضلع اعظم گڈھ میں ریلوے لائن بچھائی گئی۔

ایک صاحب نے ملٹی نیشنل کمپنیوں کے خلاف بولتے ہوئے کہا کہ ملٹی نیشنل کمپنیوں کا مقصد اکسپلائٹیشن ہے۔ یہ لوگ جہاں جاتے ہیں وہاں واٹر، لینڈ، فارسٹ ہر چیز پر قبضہ کرتے ہیں۔

میں نے کہا کہ یہ یکطرفہ بات ہے۔ آپ جیسے لوگ ان کمپنیوں کے مائنس پہلوؤں کا مبالغہ آمیز انداز میں ذکر کرتے ہیں اور پلس پہلوؤں کا بالکل ذکر نہیں کرتے۔ یہ فطرت کے قانون کے خلاف ہے کہ کوئی شخص یا ادارہ لوگوں سے صرف چھینے اور ان کو کچھ نہ دے۔ کوئی ڈاکو بھی ایسا نہیں کرسکتا۔ چنانچہ یہ کمپنیاں اگر خود منافع کماتی ہیں تو اس کا ایک حصہ وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔ یہ کمپنیاں ہزاروں، لاکھوں کو روزگار دیتی ہیں۔ وہ گورنمنٹ کو بڑے بڑے ٹیکس دیتی ہیں جو رفاہ عامہ کے کاموں میں خرچ ہوتا ہے۔ وہ تعلیم اور دوسرے مقاصد کے لئے ادارے کھولتی ہیں۔ وہ چیلنج کی صورت پیدا کر کے سارے سماج میں تعمیر وترقی کا ماحول قائم کرتی ہیں۔ وہ ملک کے مدفون وسائل کو قابل استعمال بناتی ہیں، وغیرہ۔

خواہ ملٹی نیشنل کمپنیوں کا معاملہ ہو یا کسی اور چیز کا معاملہ، کوئی آدمی صحیح رائے تک اُس وقت پہنچ سکتا ہے جب وہ نفرت اور محبت سے اوپر اٹھ کر رائے قائم کرے۔ لوگ عام طور پر اس معاملہ میں منصف نہیں ہوتے۔ وہ یا تو نفرت کے تحت رائے قائم کرتے ہیں یا محبت کے تحت، اس لیے

دونوں حالتوں میں اُن کی رائے غلط ہو جاتی ہے۔

ایک مجلس میں اکنامکس کے ایک افسر اکنامک گلوبلائزیشن کے عنوان پر جوش کے ساتھ بول رہے تھے۔ وہ ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کی خرابیاں بتار ہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ یہ کمپنیاں لبرلزم میں یقین رکھتی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو کسی حکومت کے سامنے جوابدہ نہیں سمجھتیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ غلط ہے۔ اقتصادی سرگرمیوں پر حکومت کا کنٹرول ہونا ضروری ہے۔

یہی تمام انٹلکچولس کا حال ہے۔ وہ ایک آئیڈیل اپنے سامنے رکھ کر بے تکان موجودہ سسٹم پر تنقید کرتے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ اس دنیا میں انتخاب آئیڈیل اور غیر آئیڈیل کے درمیان نہیں ہے بلکہ چھوٹی برائی (lesser evil) اور بڑی برائی (greater evil) کے درمیان ہے۔ آئیڈیل قائم کرنے کی کوشش صرف برائی میں اضافہ کرتی ہے۔ سیکولر دنیا میں مارکسزم اور مسلم دنیا میں اسلام ازم اسی کی مثالیں ہیں۔

اصل یہ ہے کہ سوشلسٹ اکانومی اور کیپٹلسٹ اکانومی، دونوں ہی میں فائدے بھی ہیں اور نقصان بھی۔ مگر مطالعہ اور تجربہ بتاتا ہے کہ سوشلسٹ اکانومی زیادہ بڑی برائی ہے اور کیپٹلسٹ اکانومی اس کے مقابلہ میں چھوٹی بُرائی۔ اس مسئلہ کا حل مخلوط اکانومی نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ ہم بڑی برائی کے مقابلہ میں چھوٹی برائی کو ترجیح دیں۔

انگریزی روزنامہ دی ڈیلی ٹیلی گراف (The Daily Telegraph) کا شمارہ ۲۰ ستمبر ۲۰۰۱ء دیکھا۔ اُس کے صفحہ ۷ پر ایک رپورٹ چھپی تھی جس میں ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ کو نیویارک میں ہونے والے واقعہ پر لوگوں کا تأثر درج کیا گیا تھا۔ مسز ہیلیری کلنٹن (Hillary Clinton) کا تأثر اس بارے میں ان الفاظ میں نقل کیا گیا تھا:

"I think we have to do whatever it takes. And I believe Tuesday changed everything. We are in a war situation and we're going to have to do things that people do in times of war."

یعنی ۱۱ ستمبر کے واقعہ نے سب کچھ بدل دیا ہے۔ ہم جنگ جیسی صورت حال سے دوچار ہیں۔

ہم کو وہ کرنا ہے جس کو لوگ جنگ کے حالات میں کرتے ہیں۔ ایک اور رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ امریکہ کے مسلمانوں کو امریکیوں کی طرف سے نئے تعصّبات (prejudices) کا سامنا ہے۔ وہ ایک طرح کے خوف (fear) میں جی رہے ہیں۔

لوگوں کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ ۱۱ ستمبر سے پہلے امریکہ کے مسلمان پوری طرح امن اور بے خوفی کی حالت میں زندگی گزار رہے تھے۔ لیکن ۱۱ ستمبر کے بعد وہ بے امنی اور خوف کی حالت میں مبتلا ہیں۔ ہر مسلمان پر شک کیا جانے لگا ہے۔ میں نے ایک صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ امریکہ کے مسلمانوں کو وہاں امن اور آزادی کی جو نعمت ملی ہوئی تھی، اُس کا انہوں نے شکر ادا نہیں کیا۔ اسی ناشکری کا وہ انجام ہے جس کو اب امریکی مسلمان بھگت رہے ہیں۔

۲۲ ستمبر کی سہ پہر کو میں برمنگھم سے مانچسٹر گیا۔ رات کو وہاں رہ کر ۲۳ ستمبر کی صبح کو دوبارہ برمنگھم واپس آیا۔ مانچسٹر میں عرب نوجوانوں کا ایک اجتماع ہوا۔ اس میں بعض انگریز نومسلم بھی شریک تھے۔ اس موقع پر میں نے ایک خطاب کیا۔ اس کے بعد سوال وجواب کا پروگرام ہوا۔

میری تقریر کا موضوع اجتہاد تھا۔ میں نے کہا کہ ہمارے فقہاء شریعت کے چار مصادر بتاتے ہیں۔ قرآن، سنت، اجماع، قیاس۔ لیکن معاذ بن جبل کی روایت کو اگر بنیاد بنایا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ مصادر شریعت تین ہیں: قرآن، سنت اور اجتہاد۔

اجتہاد کے سلسلہ میں میرے نزدیک ایک بہت بڑی بھول یہ شامل ہوگئی کہ لوگوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سمجھ لیا کہ اجتہاد صرف فروع میں ہے، کلیات میں نہیں۔ چنانچہ عام طور پر اجتہاد کے ماخذ کو بتانے کے لئے بنوقریظہ والی روایت کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ (**لا یصلین احد کم العصر الا فی بنی قریظه**) یہ واقعہ بلاشبہہ اجتہاد کی ایک مثال ہے۔ مگر وہ فروع میں اجتہاد کی مثال ہے۔ خود پیغمبر کی زندگی میں کثرت سے اجتہاد کی مثالیں ہیں جو بتاتی ہیں کہ اصول اور کلیات میں بھی اجتہاد کا عمل جاری رہتا ہے۔

اجتہاد کیا ہے۔ اجتہاد یہ ہے کہ بدلے ہوئے حالات میں کسی حکم شرعی کا از سر نو انطباق

(re-application) معلوم کرنا۔ مثلاً حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل نے جس کعبہ کو قبلہ بنایا وہ بتوں سے خالی تھا۔ اسی طرح انہوں نے اور ان کے ابتدائی پیرووں نے جس کعبہ کا طواف کیا وہ بتوں سے خالی تھا۔ مگر پیغمبر اسلام کو مکی دور میں جس کعبہ کو قبلہ بنانا تھا اس میں ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ اسی طرح آپ نے عمرۃ الحدیبیہ میں جب کعبہ کا طواف کیا، اس وقت بھی وہاں یہ سارے بت موجود تھے۔ آپ نے ایسا نہیں کیا کہ پہلے کعبہ کو بتوں سے پاک کریں اور اس کے بعد اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھیں یا اس کے گرد طواف کریں۔ بلکہ کعبہ کو اس کی حالت پر برقرار رکھتے ہوئے آپ نے نماز بھی پڑھی اور طواف بھی کیا۔

مگر بعد کے مسلمانوں میں اجتہادی فکر کا آغاز پیغمبر اسلام کے کُلّی واقعات سے نہیں ہوا۔ بلکہ وہ مذکورہ قسم کے جزئی واقعہ سے ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اجتہادی فکر کا عمل اپنے آغاز ہی سے فروعی مسائل میں جاری ہو گیا۔ اساسی مسائل میں یہ عمل سرے سے جاری ہی نہ ہو سکا۔ حتیٰ کہ وہ تمام ائمہ جن کو مجتہد مطلق کہا جاتا ہے، وہ سب کے سب مجتہد جزئیات تھے، نہ کہ مجتہد کلیات۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جزئی اور فروعی مسائل میں اتنی زیادہ بحثیں ہوئیں کہ فقہ اختلافی مسائل کا جنگل بن گئی۔ دوسری طرف اساسی امور میں سرے سے اجتہادی عمل کا دروازہ بند پڑا رہا۔ مثلاً انیسویں صدی میں جب استعماری طاقتیں غالب آگئیں تو ہمارے علماء صرف یہ سوچ سکے کہ ان کے خلاف مسلح جہاد کا اعلان کریں۔ حالانکہ اگر وہ حقیقی اجتہاد سے کام لیتے تو ان کا فتویٰ یہ ہوتا کہ مسلمان ان قوموں کے درمیان دعوتی جہاد جاری کریں۔ اسی طرح موجودہ زمانہ کے علماء نے تقریباً ہر مسلم ملک میں اسلامی کام اس کو سمجھا کہ وہ نفاذ شریعت کے نام پر مسلم حکمرانوں سے ٹکراؤ کی سیاست چلائیں حالانکہ اگر ان کے اندر اجتہادی بصیرت ہوتی تو وہ جان لیتے کہ موجودہ زمانہ میں سیاسی ادارہ کا تعلق قومی زندگی کے صرف ایک فیصد حصہ تک محدود ہو گیا ہے۔ بقیہ تمام امور کا تعلق آزاد اداروں (institutions) اور غیر سیاسی تنظیمات سے ہو گیا ہے۔ ایسی حالت میں انہیں چاہئے تھا کہ مسلمانوں کو یہ رہنمائی دیں کہ وہ غیر ضروری سیاسی نزاع سے اعراض کرتے ہوئے ہر شعبہ میں اسلامی ادارے اور اسلامی تنظیمات قائم

کریں۔ اس کے بعد وہ ہر ملک میں وہ سب کچھ حاصل کر سکتے ہیں جس کی امید وہ سیاسی گدی پر قبضہ سے کئے ہوئے ہیں۔

مانچسٹر برطانیہ کا ایک بڑا شہر ہے۔ صنعتی انقلاب کے ظہور کے زمانہ میں مانچسٹر کو غیر معمولی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ اگر چہ اب مانچسٹر کو وہ حیثیت حاصل نہیں رہی۔ مغربی یورپ میں پچھلے ڈھائی سو سال کے درمیان جو صنعتی شہر وجود میں آئے اُن میں سے ایک ممتاز نام مانچسٹر کا ہے۔ ۱۷۱۷ میں مانچسٹر صرف ایک قصبہ تھا جس کی آبادی دس ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ مگر ۱۸۵۱ میں مانچسٹر ترقی کر کے ایک بڑا صنعتی شہر بن چکا تھا جس کے باشندوں کی تعداد تین لاکھ سے زیادہ تھی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں مانچسٹر کپڑے کی صنعت کا بڑا مرکز بن چکا تھا۔ ۱۹۱۱ میں مانچسٹر کی آبادی ۲۳ لاکھ ہو چکی تھی۔ انیسویں صدی میں مانچسٹر برطانیہ کا دوسرا سب سے بڑا شہر سمجھا جاتا تھا مگر بیسویں صدی میں اُس کی یہ حیثیت باقی نہ رہی۔

رومیوں نے جب برطانیہ کو فتح کیا تو ۸۶۔ ۸۷ ء میں یہاں کا پہلا قلعہ بنایا گیا۔ تاہم یہاں رومن عہد کی تاریخی یادگاریں بہت کم ہیں۔ موجودہ مانچسٹر کی غالباً سب سے زیادہ نمایاں چیز وہاں کی مانچسٹر یونیورسٹی ہے۔ یہ یونیورسٹی ۱۸۵۱ میں قائم ہوئی۔ اس میں تقریباً پچیس ۲۵ ہزار طلبہ ہیں۔ ۱۹۷۰ کے بعد اس یونیورسٹی میں کافی اضافہ کیا گیا ہے۔

میرے بچپن کا واقعہ ہے۔ اُس زمانہ میں بدیشی مال کے بائیکاٹ کی دھوم تھی۔ اُس زمانہ میں مانچسٹر کے کپڑے کثرت سے ہندستان میں استعمال ہو رہے تھے۔ چنانچہ ان بدیشی کپڑوں کو گھروں سے لے کر جلایا جانے لگا۔ میرے دور افتادہ گاؤں میں یہی ہوا کہ مقامی لیڈروں کی رہنمائی میں گھروں سے مانچسٹر کے بنے ہوئے کپڑے حاصل کئے گئے اور گاؤں کے باہر میدان میں لے جا کر انہیں جلایا گیا۔ ایک صاحب کپڑے کو جلا رہے تھے اور دوسرے لوگ اُس کے گرد کھڑے ہو کر تالیاں بجا رہے تھے۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ لنکا شائر اور مانچسٹر کے کپڑے ہندستان میں نہ آئیں اور خود ملک میں کپڑے بنائے جانے لگیں۔

یہ اس معاملہ میں ہندستانی طریقہ تھا۔ دوسری طرف مانچسٹر کے طریقہ کو دیکھئے۔ اٹھارہویں صدی میں بنگال میں کھڈی پر کپڑے بنائے جاتے تھے۔ یہ کپڑے اتنے اچھے ہوتے تھے کہ وہ یہاں سے جاکر برطانیہ کی مارکیٹ میں فروخت ہوتے تھے۔ مانچسٹر والوں نے اس کا مقابلہ اس طرح کیا کہ اُنہوں نے اسٹیم پاور کو استعمال کر کے ہینڈلوم کی جگہ پاورلوم بنائے۔ پاورلوم کے کپڑے، ہینڈلوم کے مقابلہ میں کافی سستے ہوتے تھے۔ اسی کے ساتھ اُنہوں نے یہ کیا کہ وہ ہندستان سے بڑی تعداد میں کپاس خرید کر لے جانے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندستان سے کپڑے کی برآمد تقریباً ختم ہوگئی۔ اور مانچسٹر کے بنے ہوئے نسبتاً سستے کپڑوں نے ہندستان کی مارکیٹ پر قبضہ کرلیا۔

مانچسٹر کے دورانِ قیام لوگوں سے مختلف موضوعات پر باتیں ہوئیں۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں جو سب سے بڑی کمی ہے وہ یہ کہ پوری نسل منفی سوچ (negative thinking) کا شکار ہوکر رہ گئی ہے۔ اس کی ذمہ داری تمام تر خود مسلم سماج پر ہے۔ میں نے اپنی زندگی سے مختلف مثال دیتے ہوئے کہا کہ ۱۹۴۷ سے پہلے جس مسلم معاشرہ کے اندر میری پرورش ہوئی اس میں مجھے کوئی بھی مثبت پیغام نہیں ملا۔ گھر، مدرسہ، معاشرہ، لٹریچر اور تقریریں اور اسی طرح تمام ادارے، ہر موقع پر صرف منفی نفسیات کی غذا دے رہے تھے۔ مثلاً مجھے یاد ہے کہ میرے مدرسے کے صدر مدرس نے ایک بار اپنے درس میں کہا کہ انگریز ساری دنیا کا مکھن کھا گئے۔ چنانچہ برسوں تک میں اس کو لفظی طور پر درست مانتا رہا۔

اسی طرح ہندستان کے ایک مشہور لیڈر نے ہندستان کے ریلوے نظام کے بارے میں کہا کہ یہ ریلوے کا نظام نہیں ہے بلکہ یہ لوہے کی زنجیریں ہیں جن میں انگریز ہم کو جکڑ دینا چاہتا ہے۔ اس بات کو بھی میں نے بہت سے دوسرے نوجوانوں کی طرح اپنے ذہن کا حصہ بنالیا۔ اسی طرح اس زمانہ کے جن لوگوں کو سنتا اور پڑھتا تھا ان سے میرا یہ تاثر بنا کہ لندن اور برمنگھم اور مانچسٹر انگریزی استعمار کے مراکز ہیں جہاں سے ساری دنیا کو اپنے قبضہ میں لینے کی سازشیں کی جاتی ہیں۔ گویا جو چیزیں جدید ترقی کے مظاہر کی حیثیت رکھتی تھیں وہ میرے ذہن میں صرف سازش اور دشمنی کی علامات بن گئیں۔

اس طرح کی مختلف مثالیں دیتے ہوئے میں نے کہا کہ میری زندگی کا سب سے عجیب واقعہ یہ ہے کہ میں ایک ایسے دور میں پیدا ہوا جب کہ ہر طرف منفی سوچ کا جنگل اگا ہوا تھا۔ اس کے باوجود اللہ کی توفیق سے میرے لئے یہ ممکن ہوا کہ میں اس جنگل سے باہر نکلوں اور مکمل طور پر مثبت سوچ کی بنیاد پر اپنے فکر کی تشکیل کروں۔ یہ انقلاب کیسے ہوا اس کا سبب اللہ کے سوا کسی اور کو معلوم نہیں۔

مانچسٹر کی ایک مجلس میں ایک سوال کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے کہا کہ فلسطین میں پچھلی نصف صدی سے جو صورت حال قائم ہے اور نیویارک میں ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو جو صورت حال پیدا ہوئی وہ کوئی سادہ بات نہیں۔ دونوں کے درمیان گہرا ربط ہے۔ میرے نزدیک فلسطین میں عربوں کی ناکامی اس بات کی علامت ہے کہ خدا نے موجودہ مسلمانوں کو رد کر دیا ہے۔ اسی طرح ۱۱ ستمبر کو نیویارک اور واشنگٹن میں جو واقعہ پیش آیا وہ اس بات کی علامت ہے کہ اہل مغرب بھی خدا کی نظر میں رد ہو چکے ہیں۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی کوتاہی یہ ہے کہ اسلام ان کو ایک عالمی امانت کے طور پر دیا گیا تھا مگر اس کو انہوں نے اپنی قومی وراثت بنالیا۔ اور اہل مغرب کی ناکامی یہ ہے کہ اُنہوں نے خدا کی فطری نعمتوں سے خوب فائدہ اُٹھایا مگر وہ مُنعم کا اعتراف کرنے میں ناکام رہے۔

ایک گفتگو یہاں قابل ذکر ہے۔ ایک تعلیم یافتہ غیر مسلم نے مجھے بتایا کہ ایک مسلمان عالم ایک بار اُن کے یہاں آئے۔ یہاں کمرہ کی دیوار پر ایک کیلنڈر لٹک رہا تھا جس پر ایک ہندو دیوی کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔ مذکورہ شخص نے بتایا کہ نماز کا وقت آیا تو مولانا صاحب نے اپنی شیروانی اُتار کر کیلنڈر کے اوپر لٹکا دی۔ اس کی وجہ سے اس کی تصویر شیروانی کے نیچے چھپ گئی۔ اس کے بعد مولانا صاحب نے میرے کمرہ میں نماز ادا فرمائی۔

اس واقعہ کا حوالہ دیتے ہوئے میں نے کہا کہ مولانا موصوف نے جو کچھ کیا وہ بجائے خود درست تھا مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایک طرف یہ نمونہ ہے اور دوسری طرف یہ مختلف مثال ہے کہ قدیم کعبہ میں ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم وہاں روزانہ نماز ادا کرتے۔ مگر

آپ نے ایسانہیں کیا کہ پہلے ان بتوں کے اوپر چادر کا پردہ ڈالیں اور پھر وہاں نماز ادا کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل سے ایک اہم دعوتی حکمت معلوم ہوتی ہے۔ دعوت کا کام کرنے کے لئے ایک بے حد ضروری شرط یہ ہے کہ داعی کے اندر ناخوشگوار باتوں کو نظر انداز کرنے کا مزاج موجود ہو۔ وہ ان چیزوں سے پاک ہو جو مدعو کی نظر میں کٹر پن، تنگ نظری اور عدم رواداری بن جاتی ہے۔ دعوتی کام کے لئے رواداری لازمی شرط ہے۔ داعی کے اندر اگر رواداری کا مزاج نہ ہو تو وہ کامیاب داعی نہیں ہوسکتا۔

مانچسٹر کے مختصر قیام کے بعد میں دوبارہ برمنگھم واپس آگیا۔ ۲۴ ستمبر ۲۰۰۱ کی صبح کو برمنگھم میں جناب شمشاد محمد خاں صاحب کے صاحبزادے مسٹر اسد علی خاں (۲۰ سال) سے گفتگو ہوئی۔ وہ یہاں کی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ تعلیم کی تکمیل کے بعد آپ کس فیلڈ میں جانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ابھی اس کے بارے میں کچھ طے نہیں کیا۔ میں نے کہا کہ یہ تو خود آپ کے حالات نے طے کر دیا ہے۔ ان کے والد صاحب نے ۱۹۸۳ میں برمنگھم میں اسلامک پروپیگیشن سنٹر کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ اس وقت یہ ادارہ ابتدائی حالت میں تھا۔ اب ان کی مسلسل کوشش کے نتیجہ میں وہ اسلامک پروپیگیشن سنٹر انٹرنیشنل (IPCI) کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ وہ دعوت کے میدان میں قابل قدر کام انجام دے رہا ہے۔ میں نے مسٹر اسد سے کہا کہ آپ اگر کوئی نیا کام شروع کریں تو آپ کو دوبارہ زیرو سے شروع کرنا پڑے گا۔ لیکن اگر آپ شمشاد محمد خاں صاحب کے کام میں اپنے آپ کو لگائیں تو آغاز ہی میں آپ کو ایک بنی ہوئی ترقی یافتہ بنیاد مل جائے گی اور پھر آپ اس کام کو مزید آگے بڑھانے میں کامیاب ہوسکیں گے۔

پھر میں نے کہا کہ ہر آدمی کی عمر محدود ہوتی ہے اس لئے کوئی بڑا کام اس وقت انجام پاتا ہے جب کہ نسل در نسل لوگ اس کو آگے بڑھاتے رہیں۔ مثلاً انسائیکلوپیڈیا برٹانکا یا آکسفورڈ ڈکشنری وغیرہ کو اسی تدریجی عمل کی بنیاد پر موجودہ ترقی کا درجہ ملا ہے۔ اسی حقیقت کو جارج برناڈ شا نے اپنے مخصوص انداز میں اس طرح کہا کہ میرا قد اگرچہ شکسپیر سے چھوٹا ہے مگر میں شکسپیر کے کندھے پر کھڑا ہوں:

Although I am smaller in stature than
Shakespeare, I stand upon his shoulder.

برمنگھم میں سلطان باہو ٹرسٹ کے نام سے ایک بڑا ادارہ قائم ہے۔ اس ادارہ کے تحت ایک شاندار مسجد بنائی گئی ہے۔ ۲۳ ستمبر ۲۰۰۱ کی شام کو مغرب کی نماز اس مسجد میں پڑھی۔ نماز کے بعد یہاں مقامی مسلمانوں کے ایک اجتماع میں خطاب کیا۔ اس خطاب کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلام کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے ہم کو ایک ایسی نعمت دی ہے جو ہر حال میں ہمارا حوصلہ بلند رکھے، کبھی بھی ہم کو بے حوصلگی کا شکار نہ ہونے دے۔ میرے خطاب سے پہلے ایک مسلم نوجوان نے ''زیارت مدینہ'' کے عنوان پر ایک نعت پڑھی۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ اس وقت آپ نے ایک بینا شاعر کی زبان سے مدینہ کے بارے میں ایک نظم سنی۔ پھر میں نے کہا کہ ایک بار میں علیگڑھ کے ایک جلسہ میں شریک تھا۔ وہاں ایک نابینا شاعر آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے مدینہ پر اپنی نعتیہ نظم سناتے ہوئے یہ شعر پڑھا:

مدینہ ہم نے دیکھا ہے مگر نادیدہ نادیدہ بصارت کھوگئی تو کیا بصیرت تو سلامت ہے

اسی طرح میں نے حضرت ابوبکر صدیق کا واقعہ سناتے ہوئے کہا کہ ہجرت کے بعد غار ثور میں جب مسلّح دشمن غار کے منھ تک پہنچ گئے اور حضرت ابوبکر نے اندیشہ کا اظہار کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یا ابابکر، ماظنک باثنین اللہ ثالثھما۔ یہ واقعہ اس بات کا سبق ہے کہ مومن اگر ایک ہو تو اس کے ساتھ اس کا دوسرا خدا ہے، اگر وہ دو ہو تو اس کے ساتھ اس کا تیسرا خدا ہے۔ اس طرح کی مختلف مثالیں دیتے ہوئے میں نے بتایا کہ حالات خواہ کچھ بھی ہوں صاحب ایمان کے لئے بے ہمت ہونے کا کوئی سوال نہیں۔

پھر میں نے کہا کہ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ کو نیویارک اور واشنگٹن میں جو بھیانک واقعہ ہوا اس کے نتیجہ میں ساری دنیا کا میڈیا اسلام کو ٹررزم (terrorism) کے روپ میں دیکھنے لگا۔ مگر اس عسر میں بھی یسر کا ایک پہلو نکل آیا۔ رپورٹیں بتاتی ہیں کہ اس کے بعد لوگوں کے اندر اسلام کے بارے میں تجسس (curiosity) کا ذہن پیدا ہوا۔ چنانچہ پوری دنیا میں بڑے پیمانہ پر اسلام کا مطالعہ کیا جانے

لگا۔ خود امریکی صدر بش نے واشنگٹن کے اسلامی سنٹر کی زیارت کی۔ کہا جاتا ہے کہ برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیر نے اس دوران دو بار قرآن کا مطالعہ کیا ہے۔ جرمنی سے آئے ہوئے مسٹر فاروق نے بتایا کہ جرمن میں ۱۱ ستمبر کے بعد قرآن کے جرمن ترجمہ کی مانگ اتنی زیادہ بڑھی ہے کہ مارکٹ سے جرمن ترجمہ کی کاپیاں ایک ہفتہ کے اندر ختم ہوگئیں۔ یہی معاملہ اکثر مقامات پر پیش آیا۔

اس طرح کی مختلف مثالیں دیتے ہوئے میں نے کہا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ فلا تخشوهم واخشونی (المائدہ ۳) اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے ظہور کے بعد اب دنیا میں خشیت انسانی کا دور ختم ہوگیا، اب دنیا خشیت ربانی کے دور میں داخل ہوچکی ہے۔ اب ہمیں صرف یہ کرنا ہے کہ اللہ کے ساتھ اپنے معاملہ کو درست رکھیں۔ جہاں تک انسان کے ساتھ معاملہ کا تعلق ہے، اس کو اللہ نے خود نظام فطرت کے تحت پیشگی طور پر ہمارے موافق بنا دیا ہے۔

۲۴ ستمبر کو ۱۲ بجے سے دو بجے تک آئی پی سی آئی (برمنگھم) کے دفتر میں ایک مختصر اجتماع ہوا۔ اس میں شہر کے کچھ تعلیم یافتہ مسلمان شریک ہوئے۔ مختلف دینی اور ملی موضوعات پر گفتگو ہوئی۔

ان میں سے ایک مولانا شیر خاں جمیل احمد العمری تھے۔ وہ برمنگھم کی جامع مسجد کے امام ہیں۔ اس کے علاوہ وہ بعض دینی اداروں کے ذمہ دار ہیں۔ وہ عرصہ سے ماہنامہ الرسالہ پڑھتے رہے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں راقم الحروف کی کتاب مطالعہ سیرت تھی۔ انہوں نے بتایا کہ مجھے اس کتاب کے مضامین سے پورا اتفاق ہے۔ البتہ انہوں نے کہا کہ اس کتاب میں رسول اللہ کے زمانہ کے تمام غزوات کو دفاعی قرار دیا گیا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ تو خود قرآن سے ثابت ہے۔ قرآن کے مطابق، جنگ کی ابتداء خود مشرکین کی طرف سے ہوئی ـــــ وهم بدؤا كم اول مرة (التوبة ۱۳) اسی طرح فرمایا کہ جنگ کی اجازت ان لوگوں کو دی گئی جن سے قتال کیا جارہا ہے: أُذنَ للذين يقاتَلُونَ بأنهم ظلموا (الحج ۳۹) انہوں نے اتفاق کیا اور کہا کہ میرا شبہہ رفع ہوگیا۔

ایک صاحب نے کسی مغربی خاتون کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ انہوں نے ٹی وی پر بولتے ہوئے امریکہ کے صدر سے کہا ہے کہ اگر تم کو افغانستان پر بم گرانا ہے تو اس کے اوپر کھانے کے پیکٹ

کے بم گراؤ۔ میں نے کہا کہ یہ محض ایک شاعری ہے۔ اس طرح سے کبھی کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ اس مسئلہ کا حل صرف وہی ہے جو لیبیا کے معمر القذافی نے بعد از خرابیٔ بسیار کیا۔ انہوں نے لاکر بی بم کیس کے ماخوذین کو برطانیہ کے حوالہ کر دیا۔ اسی طرح افغانستانی حکومت کو چاہئے کہ وہ کچھ انڈر اسٹینڈنگ کے ساتھ اسامہ بن لادن کو امریکہ کے حوالہ کر دے۔ اس مسئلہ کا یہی واحد پر امن حل ہے۔ یہ گفتگو ۲۴ ستمبر ۲۰۰۱ء کو ہوئی۔

۲۴ ستمبر ۲۰۰۱ کی شام کو اسلامک پروپیگیشن سنٹر انٹرنیشنل کے ہال میں ایک اجتماع ہوا۔ مغرب کی نماز یہاں باجماعت پڑھی گئی۔ تلاوت قرآن کے بعد میرا خطاب شروع ہوا۔ اس کا موضوع تھا اسلام اور امن (Islam and Peace)۔ ایک گھنٹہ کی یہ تقریر ویڈیو کیسٹ پر ریکارڈ کی گئی۔

میں نے اپنی تقریر میں بتایا کہ اسلام میں امن کی بے حد اہمیت ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ قرآن کی تمام تعلیمات براہ راست یا بالواسطہ طور پر امن سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کا کوئی بھی تقاضہ پر امن صورت حال کے بغیر انجام نہیں دیا جا سکتا۔

پھر میں نے بتایا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ: والصلح خیر (النساء ۱۲۸) اس کا مطلب یہ ہے کہ صلح کی پالیسی سے امن قائم ہوتا ہے۔ ٹکراؤ کے ماحول میں کوئی تعمیری کام نہیں کیا جا سکتا۔ اُس کے مقابلہ میں امن کے ماحول میں ہر کام کو کرنا ممکن ہو جاتا ہے۔

برمنگھم میں کئی چھوٹی بڑی مسجدیں ہیں۔ ایک سڑک سے گذرتے ہوئے ایک بڑی مسجد نظر آئی۔ اُس کے اوپر جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا ـــــ قرآن پڑھئے، جو کہ آخری عہد نامہ ہے:

Read Al-Qur'an , the Last Testament.

مسجد کی بیرونی سمت میں لگا ہوا یہ بورڈ علامتی طور پر بتا رہا تھا کہ مغربی دنیا میں اسلام کی تبلیغ کے کھلے مواقع موجود ہیں۔ ان مواقع کو استعمال کرنے کی شرط صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ مسلمان اپنی کسی روش سے داعی اور مدعو کے درمیان نفرت کی فضا قائم نہ کریں۔ معتدل فضا میں اسلام کی اشاعت ہوتی ہے، اور نفرت اور تناؤ کی فضا میں اسلام کی اشاعت کا عمل رُک جاتا ہے۔

برمنگھم میں کچھ لوگوں نے یہ سوال کیا کہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی اور دوسرے عرب علماء نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ خودکُش بمباری (suicide bombing) اسلام میں جائز ہے، بلکہ وہ استشہاد ہے، یعنی شہادت کی طلب میں اپنے آپ کو ہلاک کرنا۔ میں نے کہا کہ مجھے اس رائے سے سخت اختلاف ہے۔ خودکش بمباری بلاشبہہ اسلام میں حرام ہے۔ مفروضہ استشہاد کے حق میں کوئی بھی شرعی دلیل موجود نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں شہید ہونا ہے، شہید کروانا نہیں ہے۔ یہ بلاشبہہ ایک افضل موت ہے کہ کوئی شخص اللہ کے راستہ میں مارا جائے۔ مگر اسلام کا نام لے کر اپنے آپ کو مارنا یا مروانا ایک ایسا فعل ہے جس کی اسلام میں کوئی گُنجائش نہیں۔

اس معاملہ کی مزید وضاحت کرتے ہوئے میں نے کہا کہ بصارت نہ ہو تو آدمی کو کچھ دکھائی نہیں دیتا، اسی طرح اگر بصیرت نہ ہو تو وہ سچائی کو نہ دیکھ سکے گا۔

العارف احمد مانچسٹر میں رہتے ہیں۔ اُنہوں نے مانچسٹر یونیورسٹی میں ریسرچ کے لیے اپنا رجسٹریشن کرایا ہے۔ مانچسٹر میں گفتگو کے دوران اُنہوں نے بتایا تھا کہ دو سال گذرنے کے بعد بھی اب تک ریسرچ کا کام آگے نہ بڑھ سکا۔ پوچھنے پر اُنہوں نے بتایا تھا کہ اُن کی اہلیہ جو ایک عرب خاتون ہیں، وہ انگریزی بالکل نہیں جانتیں۔ یہاں کے معاشرہ میں وہ اب تک اجنبی بنی ہوئی ہیں۔ چنانچہ مارکیٹ، وغیرہ کا سارا کام ان ہی کو کرنا پڑتا ہے۔ اِن گھریلو مصروفیتوں کی بنا پر وہ ریسرچ کے کام کے لیے زیادہ وقت نہیں دے پاتے۔

العارف احمد کی یہ بات میرے دماغ میں ایک بوجھ بنی ہوئی تھی۔ کسی نوجوان کے لیے سب سے زیادہ اہم کام میرے نزدیک تعلیم ہے۔ تعلیم کا کام ہر دوسرے کام پر مقدّم ہے۔

مانچسٹر سے واپسی کے بعد جب کہ میں برمنگھم میں تھا، العارف احمد سے میں نے ٹیلی فون پر تفصیلی گفتگو کی۔ میں نے اصرار کرتے ہوئے کہا کہ تعلیم کے معاملہ میں آپ کو اس اُصول پر عمل کرنا چاہئے کہ:

If you have a good excuse, don't use it.

میں نے اُن سے کہا کہ آپ تعلیم کے معاملہ میں کسی بھی مسئلہ کو رکاوٹ نہ بنائیں۔ اُنہوں نے کہا کہ پھر میرے گھریلو مسئلہ کا حل کیا ہے۔ میں نے کہا کہ میرے پاس اس کا کوئی بنا بنایا فارمولا نہیں۔ مگر میں یہ جانتا ہوں کہ مسئلہ کو اگر اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تب بھی فطری اسباب کے تحت اُس کا کوئی نہ کوئی حل نکل آتا ہے۔ میں نے کہا کہ:

Not to solve the problem is also a way of solving the problem.

۲۶ ستمبر ۲۰۰۱ کو برمنگھم سے واپسی ہوئی۔ برمنگھم سے لندن ایرپورٹ تک کا فاصلہ روڈ کے ذریعہ طے ہوا۔ یہاں کی سڑکوں پر سفر کرنے کا تجربہ اس سے بالکل مختلف ہے جو دہلی یا ہندستان کے کسی اور بڑے شہر میں ہوتا ہے۔ ہمارے شہروں میں لوگ بہت کم ٹریفک رول کی پابندی کرتے ہیں۔ مگر یہاں یا کسی اور مغربی ملک میں ایسا نہیں۔ یہاں کی سڑکوں پر گاڑی چلانے والے عام طور پر ٹریفک کے قواعد کی سخت پابندی کرتے ہیں۔ ہارن کی آواز تو کبھی سنائی ہی نہیں دیتی۔

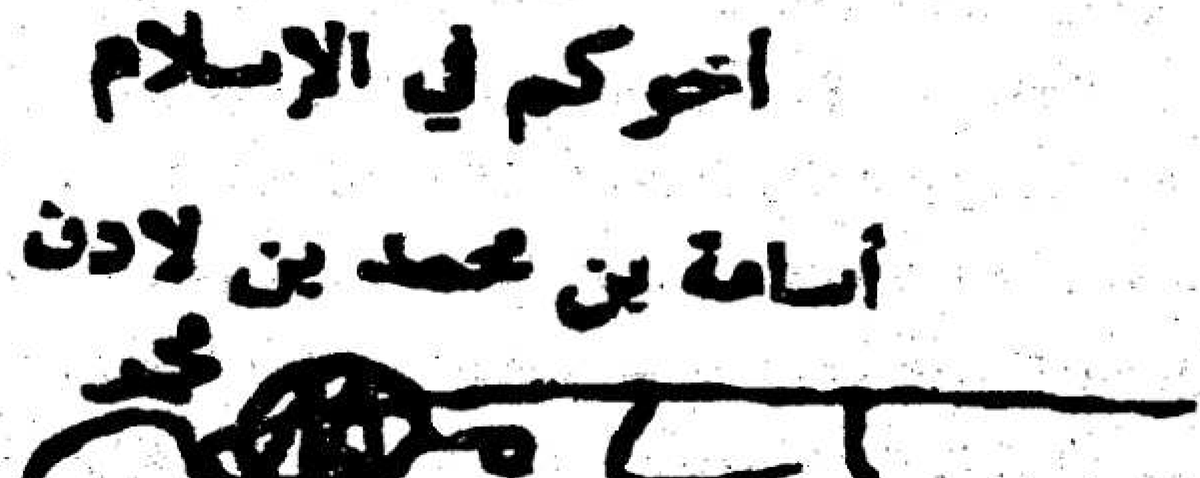
یہاں کے شہروں میں اور ہندستانی شہروں میں کیوں یہ فرق پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ عام طور پر یہ بتائی جاتی ہے کہ مغربی شہروں میں بہت زیادہ تربیت کے بعد گاڑی چلانے کا لائسنس دیا جاتا ہے جب کہ ہندستان میں گاڑی چلانے کا لائسنس خرید وفروخت کی ایک چیز بن گیا ہے۔ مگر میرے نزدیک زیادہ بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہندستان میں گاڑی چلانے والے کو سزا کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ وہ ٹریفک کے اصول کی خلاف ورزی کر کے بھی نہایت آسانی کے ساتھ سزا سے بچ سکتا ہے، بشرطیکہ اُس کی جیب میں اس کی قیمت ادا کرنے کے لیے پیسے موجود ہوں، جب کہ مغربی ملکوں میں یہ حال ہے کہ ٹریفک کے اصول کی خلاف ورزی کرنے کے بعد کسی شخص کے لیے سزا سے بچنا ممکن نہیں۔

۲۶ ستمبر ۲۰۰۱ء کو واپسی کا سفر تھا۔ شام کو لندن ایرپورٹ پہنچا۔ دہلی اور لندن کے درمیان ایک عجیب فرق یہ نظر آیا کہ آتے ہوئے دہلی ایرپورٹ پر پولیس اور سیکورٹی کا جو ہنگامہ دکھائی دیا تھا وہ لندن ایرپورٹ پر بالکل نہ تھا۔ یہاں بالکل معمول کی فضا تھی۔ ۱۱ ستمبر کے واقعہ سے پہلے لندن ایرپورٹ کا جو حال تھا وہی حال ۱۱ ستمبر کے بعد بھی دکھائی دیا۔ مگر دہلی ایرپورٹ

میں غیر ضروری طور پر صورت حال بالکل مختلف تھی۔

لندن سے دہلی کے لیے برٹش ایرویز کے ذریعہ واپسی ہوئی۔ جہاز ٹھیک اپنے وقت پر روانہ ہوا۔ راستہ میں مختلف اخبار اور میگزین دیکھے۔ ایک دلچسپ رپورٹ اُسامہ بن لادن کے بارے میں یہ تھی۔

دوران سفر لندن کے انگریزی روزنامہ دی ٹائمس (The Times) کا شمارہ ۲۵ ستمبر ۲۰۰۱ء دیکھا۔ اُس کے پہلے صفحہ پر ایک عجیب وغریب تصویر تھی۔ یہ اُسامہ بن لادن کا عربی میں دستخط تھا۔ اس میں دلچسپ بات یہ تھی کہ اُس کے کیپشن میں یہ لکھا ہوا تھا ——— یہ اسامہ بن لادن کا دستخط ہے جو انہوں نے ایک بیان پر کیا۔ ہینڈ رائیٹنگ کے ایک اکسپرٹ کے مطابق، دستخط کا یہ انداز بتاتا ہے کہ دستخط کرنے والا بہت زیادہ غیر مطمئن ہے اور اپنے تحفظ کی شدید ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اُسامہ کے دستخط کی یہ تصویر یہاں نقل کی جارہی ہے۔



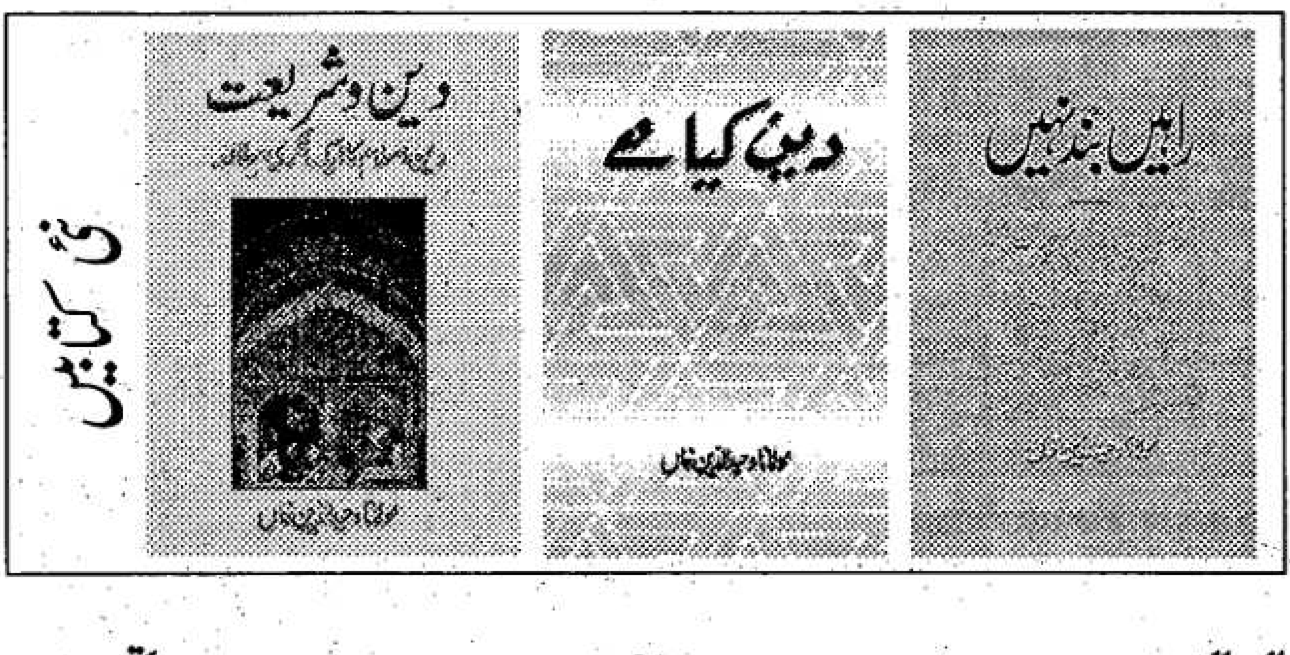
The signature of Osama bin Laden on yesterday's statement: it shows someone who is chronically unhappy and in great need of self-protection, according to a handwriting expert.

اسامہ بن لادن کے دستخط کا انداز بتاتا ہے کہ وہ ایک ایسا انسان ہے جو شدید طور پر رنجیدہ ہے اور اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرتا ہے۔ یہ بات بے حد اہم ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ

زمانہ میں اسامہ بن لادن کو دنیا بھر کے مسلمانوں کے درمیان غیر معمولی مقبولیت کیوں حاصل ہوئی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ خود دنیا بھر کے مسلمان بھی اسی نفسیات میں جی رہے تھے۔ مسلمان دوسری قوموں کے خلاف اپنے دل میں سخت شکایت رکھتے تھے۔ وہ دوسری قوموں کو ظالم فرض کرکے اپنے آپ کو مظلوم سمجھے ہوئے تھے۔ اس طرح وہ گویا ایک محصور ذہنیت (besieged mentality) میں مبتلا تھے۔ اسامہ بن لادن نے وہی منفی بولی بولنا شروع کیا جو موجودہ مسلمانوں کی نفسیات کے عین مطابق تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اسامہ بن لادن کو ساری دنیا کے مسلمانوں میں زبردست مقبولیت حاصل ہوئی۔

یہ بات بجائے خود درست ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو دوسری قوموں سے کچھ شکایات پیدا ہوئیں۔ مگر ایسی حالت میں اصل کام یہ تھا کہ ان شکایتوں کو پہلے ہی مرحلہ میں مثبت کوششوں کے ذریعہ ان کے ذہن سے نکالا جائے۔ کیوں کہ کوئی بھی قوم صرف مثبت ذہن کے تحت دنیا میں قائم ہوسکتی ہے نہ کہ منفی ذہن کے تحت۔ اسامہ بن لادن سمیت موجودہ زمانہ کے تمام مسلم لیڈروں نے یہی غیر مطلوب کام کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسری قوموں کے خلاف شکایات مسلمانوں کے تحت شعور (sub-conscious mind) میں داخل ہوگئیں۔ اور جب کوئی خیال انسان کے تحت شعور میں داخل ہوجائے تو وہ ایک ایسا نفسیاتی مریض بن جاتا ہے جس کی اصلاح سرے سے ممکن ہی نہ ہو۔

برطانیہ کے سفر کے بعد ۲ ستمبر کی صبح کو میں دہلی واپس پہنچا۔



سوال وجواب

مزسارہ بینکرافٹ (Sarah Bincroft) لندن کے انگریزی اخبار انڈیپنڈنٹ (Independent) کی اسوسی ایٹ ایڈیٹر ہیں۔ اپریل ۲۰۰۲ء کے آخری ہفتہ میں وہ نئی دہلی میں تھیں۔ ایک ملاقات کے دوران اُنہوں نے اپنے کچھ سوالات لکھ کر دیئے۔ یہ سوالات مسٹر محمد خالد انصاری (ہندستان ٹائمس) نے ہمارے پاس روانہ کیے ہیں۔ یہ سوالات اُنہی کے الفاظ میں صفحہ کے نیچے درج کیے جارہے ہیں۔ اُن کے سوالات کا جواب جو اُنہیں بذریعۂ ای میل بھیجا گیا، اُس کو یہاں نمبروار نقل کیا جاتا ہے۔

1. What is the purpose of man's existence?
2. Once our body perishes, where exactly the life-force that leaves the body goes?
3. Man being caught up in a whirlpool, where each philosophy claims to be the ultimate one, how can we be sure of a particular form or shape of life after this?
4. If this is not the real face of Islam, then what real Islam is?
5. Could you suggest some useful reading meterial that, while providing better intellectual conviction, can supercede the existing philosophy (be it Christianity, Hinduism and Judaism etc.) about the existence of man?

۱۔ موجودہ دنیا میں انسان کے وجود کا مقصد کیا ہے، اس سوال کو سمجھنے کے لیے ہمیں یہ جاننا چاہیے کہ خدا کا تخلیقی نقشہ (creation plan) کیا ہے۔ قرآن کے مطابق، خدا نے ایک آئیڈیل دنیا بنائی جس کو جنت (پیراڈائس) کہا جاتا ہے۔ یہ ایک ابدی اور مکمل دنیا ہے جہاں انسان وہ سب کچھ پالے گا جو وہ چاہتا ہے۔ موجودہ مختصر دنیا وہ مقام انتخاب ہے جہاں اُن افراد کو چُنا جارہا ہے جو موت کے بعد آنے والی ابدی دنیا میں بسائے جانے کے قابل ہوں۔

مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو استثنائی طور پر لامحدود استعداد

(unlimited capacity) رکھتا ہے۔ دنیا کا سب سے زیادہ مصروف یا سب سے زیادہ کامیاب انسان بھی اپنے ذہن (mind) کا بمشکل دو فیصد حصہ کو استعمال کر سکا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ دنیا اپنی محدودیت کی بنا پر اتنی گنجائش ہی نہیں رکھتی کہ جہاں کوئی آدمی اپنی پوری استعداد کے ساتھ جی سکے۔

اس مطالعہ کے مطابق، انسان کی استعداد اور قابل حصول دنیا میں ایک تضاد پایا جاتا ہے۔ یہ تضاد اس بات کا ایک قرینہ ہے کہ موجودہ دنیا کے علاوہ ایک اور دنیا ہو جہاں انسان اپنے لیے پوری تکمیل (fulfilment) پا سکے، جہاں آدمی کے لیے اپنی پوری استعداد کے ساتھ جینا ممکن ہو۔ یہ گویا اس بات کی ایک نفسیاتی شہادت ہے کہ آج کی محدود دنیا کے علاوہ ایک لامحدود اور کامل دنیا موجود ہے، اسی دوسری دنیا کا نام جنت ہے۔

اس تخلیقی نقشہ کے مطابق، موجودہ دنیا کی حیثیت گویا انتخاب کا ایک ابتدائی مقام ہے۔ یہاں وہ افراد چُنے جا رہے ہیں جو اپنے قول وعمل سے اس بات کا ثبوت دیں کہ وہ جنت کی نفیس دنیا میں بسائے جانے کے قابل ہیں۔

۲۔ موت کے بعد کیا ہوتا ہے، اس سوال کا جواب یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں کسی انسان پر جو موت واقع ہوتی ہے وہ اُس کے موجودہ جسم پر واقع ہوتی ہے، اُس کی روح پر نہیں۔ انسان ایک ایسی ہستی ہے جو تغیر پذیر جسم کے اندر ایک غیر تغیر پذیر چیز کی حیثیت رکھتی ہے:

personality is changelessness in change.

اسلام کے مطابق، جب کوئی انسان مرتا ہے تو وہ اپنے موجودہ مادّی جسم کو چھوڑ کر اگلی دنیا میں چلا جاتا ہے جہاں وہ نئے اور زیادہ بہتر جسم کے ساتھ ہمیشہ کے لیے رہ سکے۔

۳۔ بھنور (whirlpool) کا نظریہ کچھ فلسفیوں کا ایک خیالی نظریہ ہے۔ اسلام نے زندگی کا جو تصور دیا ہے اُس میں ایسا کوئی مرحلہ نہیں۔ اسلام کے مطابق، ایسا نہیں ہے کہ مرنے کے بعد ساری انسانی روحیں بھنور کی مانند کسی ایک جگہ عالم پریشانی میں اکٹھا ہو رہی ہوں۔ اسلام کے مطابق، ہر انسان کا تشخص الگ ہے۔ ہر انسان اپنا ایک مستقل وجود رکھتا ہے۔ ہر انسان موجودہ دنیا

میں اپنے قول وعمل کے ریکارڈ کے مطابق، اپنی ایک بُری یا اچھی شخصیت بناتا ہے۔ اسی کے مطابق، اگلی دنیا میں اُس کا اچھا یا بُرا انجام ہونے والا ہے۔ اچھے انجام والے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور بُرے انجام والے لوگ جہنم میں داخل کیے جائیں گے۔

۴۔ اسلام کا تصور حیات فلسفہ اور موجودہ مذاہب دونوں سے الگ ہے۔ اسلام کا تصور تمام تر امتحان (test) کے تصور پر مبنی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ دنیا ایک قسم کی تربیت گاہ ہے۔ یہاں آدمی کو آزادانہ اختیار دے کر یہ موقع دیا گیا ہے کہ وہ یہاں کے مختلف حالات سے گذرتے ہوئے اپنے آپ کو تیار کرے۔ وہ منفی واقعات کا مثبت جواب دے۔ وہ ناموافق تجربات کے باوجود بُلند کرداری کا ثبوت دے۔ وہ وقتی جذبات سے غیر متاثر رہ کر مستقبل کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے۔ وہ وقتی داعیات سے غیر متاثر رہ کر ابدی حقیقتوں میں جینے کا ثبوت دے۔ وہ آزادی کے باوجود اپنی اَنا کو خدا کے آگے جھکا دے۔ وہ خود پسندی کی زندگی گذارنے کے بجائے خدا رخی زندگی (God oriented life) گذارے۔ وہ دنیا کی تعمیر کے بجائے آخرت کی تعمیر کو اپنا مقصد حیات بنائے۔

۵۔ آپ نے اپنے مطالعہ کے لیے کچھ کتابیں دریافت کی ہیں۔ اسلام کو سمجھنے کے لیے آپ کو قرآن اور حدیث رسول کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ قرآن وحدیث کے علاوہ موجودہ زمانہ میں بہت سی کتابیں اسلام کے تعارف اور تشریح میں لکھی گئی ہیں۔ اُن میں سے ایک راقم الحروف کی کتاب ہے جس کا نام یہ ہے: *Islam Re-discovered*

سوال

گجرات میں مسلمانوں کی نسل کشی اس بات کی متقاضی ہے کہ ملک کے مسلمان ذات وبرادری اور مسلکی اختلافات سے یکسر کنارہ کش ہو کر اور متحد ہو کر کوئی دائمی لائحہ عمل تیار کریں۔ خصوصاً مسلم علماء، لیڈر، دانشور اور حکومت کے اندر خدمات انجام دینے والے سر جوڑ کر بیٹھیں۔ جذبات سے مغلوب ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمام مسلمانوں کو انصاف کی آواز بلند کرنی چاہئے۔ جن لوگوں کو اللہ نے لائق وفائق بنایا ہے اور وہ اس سے اعراض کرتے ہیں تو قیامت کے دن سخت جواب دہ ہوں گے

اور انہیں تاریخ معاف نہیں کرے گی۔ کیا کم از کم ہم آئین کے تحت بھی ایسا کرنے کے اہل نہیں (محبوب الرحمٰن پھلواری شریف)۔

جواب

آپ کی تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندستان کے مسلمان متحد ہو کر آئین کے مطابق، اپنی آواز بلند کریں، اس سے ان کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ آپ کو یاد نہیں کہ یہ کام بار بار کیا جا چکا ہے اور ہر بار نا کام ہوا ہے۔ چونکہ ان کوششوں کا کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلا، اس لئے آپ سمجھتے ہیں کہ کوشش بھی نہیں کی گئی۔

تاریخ بتاتی ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد خلافت کے نام پر برصغیر کے تمام مسلمان متحد ہو گئے، مگر اس اتحاد کا مطلوب نتیجہ مسلمانوں کے حصہ میں نہیں آیا۔ اس کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کا غلغلہ بلند ہوا اور دوبارہ برصغیر ہند کے تمام مسلمان اُس کے پلیٹ فارم پر اکٹھا ہو گئے، مگر یہ اتحاد بھی عملاً بے نتیجہ رہا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ہندستان میں آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت قائم ہوئی۔ اس مجلس میں بھی ہر طبقے کے مسلمان شریک ہو گئے مگر اس اتحاد کے باوجود مسلمانوں کی حالت جہاں پہلے تھی وہیں اَب بھی رہی۔ اس کے بعد آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ قائم ہوا مگر یہ اتحاد بھی وقتی ہنگاموں کے بعد سراسر بے نتیجہ رہا، وغیرہ۔

اَصل یہ ہے کہ متحد ہو کر آواز بلند کرنا سرے سے کوئی کام ہی نہیں۔ اَصل کام یہ ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم کو عام کیا جائے، اُن کو باشعور بنایا جائے۔ مسلمانوں کے اندر یہ صلاحیت پیدا کی جائے کہ وہ اپنی داخلی اصلاح کر کے اپنے آپ کو مستحکم بنائیں۔ مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ زمانے کو سمجھیں اور حالات کی رعایت کرتے ہوئے اپنے عمل کی منصوبہ بندی کریں۔ ہمارے مسئلے کا حَل مثبت عمل میں ہے، نہ کہ متحد ہو کر احتجاج کرنے میں۔

سوال

الرسالہ جون ۲۰۰۲ میں آپ کا مضمون ''اصل سبب جہالت'' پڑھا۔ میرے نزدیک یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مسلمانوں کے اوپر جو کچھ بیت رہا ہے اس کا اصل سبب صرف جہالت ہے۔ آپ کی اس قسم کی

بے موقع تشریحات سے آپ کے مخالفین کو یہ موقع مل جاتا ہے کہ وہ آپ کو غیر ضروری طور پر بدنام کریں۔ ورنہ آپ کی مثبت فکر کے نتائج خاطر خواہ برآمد ہو سکتے تھے۔ کسی بھی تبصرے کے وقت حالات کا تناظر پیش رہنا چاہئے۔ ایک عالم دین اور ایک مصلح کی حیثیت سے آپ کے لیے مقام غور وفکر تھا کہ ایسے نازک حالات میں کس قسم کی بات کی جائے کہ مسلمانوں کو اپنے زخم خوردہ دلوں پر کوئی پھاہا محسوس ہوتا۔ مخصوص حالات کے کچھ مخصوص تقاضے بھی ہوتے ہیں جن کو ملحوظ رکھنا علماء کا ہی تو کام ہوتا ہے۔
(خالد خانقاہی۔ حیدر آباد)

جواب

اس معاملہ میں اصل سوال یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کی دل پسند باتیں کہہ کر ان کے درمیان مقبولیت حاصل کی جائے۔ بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کو یہ بتایا جائے کہ قرآن وسنت کی رہنمائی کے مطابق، اُن کے مسائل کا حل کیا ہے۔ گہرے مطالعہ کے بعد ہم نے یہ جانا ہے کہ قرآن و سنت کی رہنمائی تمام تر احتسابِ خویش پر مبنی ہے، نہ کہ احتساب غیر پر۔ دوسروں کے اوپر ذمہ داری ڈالنا غیر اسلامی طریقہ ہے اور خود ذمہ داری قبول کرنا اسلامی طریقہ۔

مکی دور میں تیرہ سال تک رسول اور اصحاب رسول کو ہر طرح ستایا گیا۔ اس معاملہ میں خدا کی طرف سے جو ہدایت دی گئی وہ صرف یہ تھی کہ تم اُن کی ایذاؤں پر صبر اور اعراض کرو (ابراہیم ۱۲) غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کو شکست ہوئی تو قرآن میں خود مسلمانوں سے کہا گیا کہ تم اپنی کوتاہیوں کی اصلاح کرو (آل عمران ۱۵۲)۔ غزوۂ حنین میں مسلمانوں کو مشرکین کی جارحیت کا شکار ہونا پڑا۔ اُس وقت بھی یک طرفہ طور پر مسلمانوں کی کمزوری کی نشاندہی کی گئی۔ (التوبہ ۲۵) حدیبیہ کے موقع پر مشرکین نے شدید حمیت جاہلیہ کا مظاہرہ کیا مگر مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ ردعمل سے بچتے ہوئے یک طرفہ طور پر متقیانہ روش اختیار کریں اور مشرکین کی شرائط پر صلح کرکے مدینہ واپس چلے جائیں (الفتح ۲۶)۔

قرآن وسنت کا مطالعہ یقینی طور پر بتاتا ہے کہ مسائل کے مقابلہ میں اسلام کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ فریقِ ثانی کی سازشوں کا انکشاف کیا جائے۔ شکایت اور احتجاج کا طوفان برپا کرکے یہ ثابت کیا

جائے کہ سارا قصور صرف فریقِ ثانی کا ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، وہ سرتا سر مظلوم اور بے قصور ہیں۔ اس قسم کی روش قومی شریعت میں درست ہوسکتی ہے مگر وہ خدائی شریعت کے مطابق، سراسر بے معنیٰ ہے۔ خدائی شریعت کے مطابق، کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ اپنے حصے کی غلطی کو معلوم کیا جائے اور اس کی اصلاح کی جائے۔ مسئلہ کا حل اپنی غلطی کی اصلاح میں ہے، نہ کہ دوسروں کی زیادتیوں کا اعلان کرنے میں۔ اسلام کا نقطۂ نظر نتیجہ رُخی (Result Oriented) ہے۔ اسلام کا طریقہ دل کی بھڑاس نکالنا نہیں۔

سوال

الرسالہ مئی ۲۰۰۲ (صفحہ ۲۶) میں آپ نے لکھا ہے کہ "اسلام کے مطابق" صرف قائم شدہ حکومت ہی کو اسلحہ کے استعمال کا حق ہے۔ غیر حکومتی ادارہ کو کسی بھی عذر کی بناء پر ہتھیار کے استعمال کا حق نہیں"۔ سوال یہ ہے کہ کسی مسلم گاؤں یا قصبہ میں اسلام دشمن عناصر اچانک حملہ کرکے ان کے معصوم بچوں کا قتل، عورتوں کی آبروریزی اور اُن کے مال واسباب کا لوٹ کھسوٹ شروع کردیں، ایسے وقت میں وہاں کے مسلمان کیا کریں؟ آیا "إن تصبروا وتتقوا لا يضرّكم كيدهم شيئا" پر عمل پیرا ہوں جسے الرسالہ نے ایسے مواقع کے لئے قرآنی اصول بتایا ہے اور اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی بہو بیٹی کی عزت وآبرو نیلام ہوتا ہوا اور اپنے معصوم بچوں کے خون سے گھر بار نہا تا ہوا دیکھتے رہیں یا ظالم کو ظلم و تعدّی، جور وجفا، قتل وغارت گری سے روکنے کے لئے ہتھیار کا استعمال کریں؟ (محمد اسحاق فیضی، کشن گنج، بہار)

جواب

الرسالہ میں جو بات کہی گئی ہے وہ نیشنل وار کے بارے میں ہے، وہ ذاتی ڈیفنس کے بارے میں نہیں ہے۔ جب ملک یا قوم کو کسی کی طرف سے حملہ کا سامنا ہو تو اُس کے مقابلہ میں دفاعی جنگ کا حق صرف قائم شدہ حکومت کو ہے، عوام کو نہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے عوام کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اس قسم کے حملہ کا نام لے کر آزاد تنظیمیں بنائیں اور بطور خود مسلّح جنگ شروع کردیں۔ البتہ جہاں تک ذاتی

دفاع کا سوال ہے تو اُس کا حق بلاشبہہ افراد کو حاصل ہے۔ تاہم یہ دفاع بھی مسئلہ کو حل کرنے کے لیے ہونا چاہئے، نہ کہ مسئلہ میں مزید اضافہ کے لئے۔

اس سلسلہ میں دوسری قابل لحاظ بات یہ ہے کہ کچھ لوگ اگر کسی گاؤں پر حملہ کریں تو اس معاملہ میں انتہائی حقیقت پسندانہ انداز میں سوچ کر یہ جاننا چاہئے کہ یہ حملہ یک طرفہ طور پر بلاسبب ہوا ہے یا وہ کسی پیشگی کارروائی کے انتقام کے لیے ہوا ہے۔ اگر وہ انتقام کا معاملہ ہے تو اُس کا حقیقی حل یہ ہے کہ انتقام کے سبب کو دور کیا جائے۔ ورنہ عملاً یہ ہوگا کہ ایک انتقام کے بعد دوسرا انتقام اور دوسرے انتقام کے بعد تیسرا انتقام لیا جاتا رہے گا، اور اصل مسئلہ صرف بڑھتا رہے گا، وہ کبھی ختم نہ ہوگا۔

سوال

کہا جاتا ہے کہ جو مسلمان اللہ کے راستہ میں لڑتا ہوا مارا جائے وہ شہید ہوگا اور اُس کو جنت میں جگہ ملے گی۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا وہ مسلم ماں بھی جنت میں جائے گی جس نے ایسے شہید کو جنم دیا۔
(ترنم ریاض، نئی دہلی)

جواب

آخرت کا انعام کسی کو نسلی تعلق کی بنا پر نہیں ملتا۔ وہ ذاتی عمل کی بنیاد پر ملتا ہے۔ اگر کسی ماں نے اپنے بیٹے کی دینی تربیت کے لیے محنت کی اور اُس کی محنت سے اُس کا بیٹا سچا دیندار بنا تو اس قسم کے عمل کا ثواب ضرور ماں کو پہنچے گا۔ مگر محض نسلی تعلق کی بنا پر کسی مرد یا عورت کو کوئی ثواب ملنے والا نہیں۔

شہادت کے سلسلہ میں عرض ہے کہ مسلمان کسی کو شہید کے لفظ سے پُکاریں تو ایسا کرنے سے کوئی شخص شہید نہیں بن جائے گا۔ شہادت کا تعلق تمام تر نیت سے ہے۔ اور نیت کا حال صرف اللہ کو معلوم ہے۔ صرف اللہ یہ جانتا ہے کہ کون حقیقی معنوں میں شہید کا درجہ پانے کا مستحق ہے۔ اسی لیے امام البخاری نے اپنی صحیح میں کتاب الجہاد کے ایک باب کا عنوان (ترجمۂ باب) ان الفاظ میں قائم کیا ہے: **باب لا یقال فلان شہید** (یہ نہ کہو کہ فلاں شہید ہے)۔ فتح الباری جلد ۶ صفحہ ۱۰۵۔

سوال

جب ہم لوگ قرآن کا متن پڑھتے ہیں تو اُس کی بہت ساری سورتیں شعر جیسی لگتی ہیں۔ جیسے سورہ الرحمٰن اور پارہ عم۔ آپ سے گزارش ہے کہ اس سلسلہ میں ہم اور ہمارے جیسے لوگوں کی دماغی صفائی کے لئے الرسالہ کے صفحات پر تشفی بخش جواب لکھ کر ہم حامیان الرسالہ کو مطمئن کریں۔
(محمد نسیم احمد، مشرقی چمپارن، بہار)

جواب

شعر کا جو معروف اسلوب ہے، اُس کے مطابق، قرآن شعر کی زبان میں نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ قرآن کی آیتوں میں ایک صوتی آہنگ ہے۔ چنانچہ ایک مستشرق نے لکھا ہے کہ:

Sound art in the Qur'an is par excellance.

مگر یہ صوتی آہنگ ادب کی زبان میں موزونیت (rhythm) ہے، نہ کہ شعر۔

سوال

اسلام کے فکری غلبہ کے بارے میں آپ کی بات سے مجھے پورا اتفاق ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ تعارف اسلام کے سلسلہ میں سائنٹفک انداز تحریر جو آپ کی تحریروں میں ملتا ہے اُسے حاصل کرنے کی کیا صورت ہوگی۔ امید ہے کہ ان چیزوں کی تفصیل سے آپ مجھے مطلع فرمائیں گے۔
(محمد نعمت اللہ، حیدر آباد)

جواب

اس سلسلہ میں قرآن سے دو رہنما اُصول ملتے ہیں۔ ایک یہ کہ داعی کا کلام اپنی زبان کے اعتبار سے عصری اُسلوب میں ہو۔ یہ اُصول قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے: وما أرسلنا من رسول إلا بلسان قومه (ابراہیم ۴) اس ضمن میں دوسرا اُصول جو قرآن سے معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ داعی کا کلام مخاطب کے اپنے معیار کے مطابق، اتنا مدلّل ہو کہ وہ اُس کو سُن کر اپنے آپ کو دفاعی پوزیشن میں محسوس کرنے لگے۔ یہ دوسرا اُصول قرآن کی اس آیت پر غور کرنے سے معلوم

ہوتا ہے: فبهت الذی کفر (البقرہ ۲۵۸)

میرے تجربہ کے مطابق، اس قسم کے داعیانہ کلام کے لیے داعی میں حسب ذیل صفات کا ہونا ضروری ہے ــــــ اسلامی علوم کے ساتھ مدعو کے علوم کا گہرا مطالعہ، ذہنی جمود سے خالی ہونا، متعصّبانہ ذہن سے مکمل طور پر پاک ہونا، قومی فکر کے بجائے علمی فکر کا مالک ہونا، انسانیت عامّہ کے ساتھ شفقت اور خیر خواہی کا تعلق ہونا، مصلحت بینی کے بجائے اعتراف کا مزاج ہونا، ہر دوسری طلب سے کٹ کر حق کا طالب بن جانا، وغیرہ۔

سوال

ونسینٹ پیل (Norman Vincent Peale) اپنی کتاب "The Power of Positive Thinking" میں لکھتے ہیں کہ آپ خدا کی طاقت سے ہر کام کر سکتے ہیں۔ ایک دوسری جگہ پر وہ لکھتے ہیں کہ "God is in you" یعنی خدا آپ کے اندر ہے (صفحہ ۴۴) کیا اسلامی عقیدہ کے مطابق، ایک مومن ایسا کہہ سکتا ہے کہ "خدا انسان کے اندر ہے" براہ کرم اسلام کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں۔ (خورشید احمد، شوپیان)

جواب

خدا کا یہ فلسفیانہ تصور وحدتِ حقیقت (Monism) کے اصول پر قائم ہے۔ اس نظریہ کے مطابق، دنیا کی ہر چیز خدا کے توسیعی وجود کا ایک حصہ ہے۔ چنانچہ انسان بھی خدا کا ایک حصہ ہے۔ مذکورہ بیان کے پیچھے دراصل یہی فکر کام کر رہا ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، اسلام کے نزدیک خدا اور انسان دونوں ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔ انسان صرف یہ کر سکتا ہے کہ وہ خدا سے دعا کرے۔ اگر وہ اپنی دعا میں سچا اور مخلص ہے تو خدا ضرور اُس کی دعا کو قبول کرے گا۔ مگر یہ فیصلہ کرنا خود خدا کا کام ہے کہ وہ بندہ کی دعا کو دنیا میں پورا کرے یا آخرت میں اس کا اجر عطا فرمائے۔

سوال

الرسالہ دسمبر ۲۰۰۱ کے صفحہ ۲۷ پر آپ تحریر کرتے ہیں کہ موجودہ دنیا کو خدا نے

آزمائش (test) کی مصلحت کے تحت بنایا ہے۔ اگر اس جملہ پر غور کریں تو ماننا ہوگا کہ خدا نہ عالم الغیب ہے، نہ وہ کسی کے دل کی بات کو جانتا ہے۔ کیونکہ ٹیسٹ کا فائدہ یہی ہے کہ جو ہم نہیں جانتے تھے وہ جان جاتے ہیں۔ (ایم اے خاں، کلکتہ)

جواب

ٹسٹ (test) کا مقصد یہ نہیں ہے کہ خدا خود جانے۔ ٹسٹ کا مقصد سلیکشن ہے۔ یہ ٹسٹ خدا کی نسبت سے نہیں ہے بلکہ وہ خود انسان کی نسبت سے ہے۔ یعنی انسانوں میں سے چھانٹ کر اچھے اور برے کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں، اس کا مقصد یہ ہے کہ ایک چیز جو نظری حقیقت ہے اُس کو ایک معلوم اور مشہود واقعہ بنا دیا جائے۔

سوال

ایک مسلم جماعت کے ایک صاحب سے میری ملاقات ہوئی۔ اُنہوں نے بتایا کہ ہمارے یہاں جو مجلس لگتی ہے اُس مجلس میں سبھی لوگوں کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔ میں نے کہا کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ انہوں نے بتایا کہ حدیث کا مفہوم ہے کہ جہاں اللہ اور اُس کے رسول کا ذکر ہوتا ہے اُس مجلس کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔ میں نے کہا کہ اگر وہاں کوئی بدعتی مسلمان ہو تو کیا اس کی بھی مغفرت کر دی جاتی ہے۔ اس کا وہ جواب نہ دے سکے۔ برائے مہربانی آپ اس سوال کا جواب دیں (ایک قاری الرسالہ)

جواب

حدیث (صحیح مسلم، کتاب الذکر) میں مجالس الذکر کا بیان آیا ہے۔ اُس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ایسی مجالس میں شرکت کرنے والوں کو اللہ کی طرف سے بخش دیا جاتا ہے۔ مگر اس بشارت کا اطلاق اُس مجلس پر ہے جو اللہ کی مطلوب مجلس ہو، نہ کہ کسی جماعت کے نظم کے تحت قائم کردہ مجلس۔ اسی طرح ذکر سے مراد وہ ذکر ہے جو اللہ کے علم میں ذکر ہو، نہ کہ وہ ذکر جو کسی جماعت کے اپنے وضع کردہ نظام کے تحت ذکر قرار دیا گیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ذکر ایک اعلیٰ عبادت ہے مگر ذکر سے مراد ورد نہیں ہے اور نہ کسی کی تقریر کو ذکر کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ ذکر دراصل ایک فرد مسلم کے دل میں اُمنڈنے والے اُس

ربانی طوفان کا نام ہے جو اللہ کی یاد سے اُس کے اندر پیدا ہوا ہو۔ ذکر سے مراد وہ اعلیٰ کیفیاتی عمل ہے جو آدمی کے دل کو تڑپا دے اور اُس کی آنکھوں کو اشکبار کر دے۔

سوال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں جو جنگیں ہوئی ہیں، اُن کو جہاد سے تعبیر کیوں کیا جاتا ہے۔ جب کہ اُس وقت مسلمانوں کی کوئی حکومت نہیں تھی۔ اور آپ کے کہنے کے مطابق، جہاد کے لیے established government کی ضرورت ہے۔ (ایک قاری الرسالہ، کشمیر)

جواب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے تیرہ سالہ دور میں ظلم کے باوجود جہاد نہیں کیا۔ آپ نے صرف مدنی دور میں جہاد کیا۔ اس فرق کا سبب یہ تھا کہ مکی دور میں اسلام کی حکومت قائم نہ تھی۔ البتہ ہجرت کے بعد مدینہ میں باقاعدہ حکومت قائم ہوگئی۔ اس لیے آپ نے مدینہ پہنچنے کے بعد دفاع کے طور پر جہاد کیا۔

یہ بات خلافِ واقعہ ہے کہ مدنی دور میں وہاں اہل اسلام کی حکومت نہیں تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو وہاں کے باشندوں نے آپ کا استقبال آمر اور مطاع کہہ کر کیا، یعنی حاکم اور قابل اطاعت۔ چنانچہ آپ کے مدینہ پہنچتے ہی اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آگیا۔ اس کے سربراہ اوّل خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔

جواب دینے کے لیے جس طرح علم درکار ہے، اسی طرح سوال کرنے کے لیے بھی علم درکار ہے۔ سوال کرنے والے کو چاہئے کہ وہ سوال کرنے سے پہلے اُس کے علمی تقاضہ کو پورا کرے۔ سائل جب تک اپنے حصہ کا علمی تقاضہ پورا نہ کر لے، اُس وقت تک اُس کے لیے مطالعہ ہے، نہ کہ سوال کرنا۔

سوال

میں کشمیر یونیورسٹی میں ایک ریسرچ اسکالر ہوں۔ میں نے اپنے ریسرچ کے متعلق آپ سے تحقیقی موضوع کا انتخاب کروایا تھا۔ آپ نے ''اُردو شاعری میں سائنسی مزاج'' میرے موضوع کے

لیے انتخاب کیا تھا۔ لیکن مجھے کسی بھی یونیورسٹی میں اس موضوع پر کام کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اب میں نے ''اقبال اور سیکولرزم'' کے تحقیقی مقالہ پر کام کرنا شروع کیا ہے۔ لیکن اقبال ہمیشہ تشکیک کے شکار رہے ہیں۔ اقبال کی شاعری اقبال کے تشکیکی مزاج کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ آپ اس بارے میں میری رہنمائی فرمائیں۔ (ماجد جہانگیر، کشمیر)

جواب

ہماری یونیورسٹیوں کا جو نظام ہے اُس کے تحت کسی تخلیقی موضوع کے لیے ریسرچ کی اجازت ملنا بہت مشکل ہے۔ اس لیے اگر آپ کی یونیورسٹی میں مذکورہ موضوع منظور نہ ہوسکا تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ جہاں تک ''اقبال اور سیکولرزم'' کے موضوع کا تعلق ہے، اُس کے بارے میں میری رائے ہے کہ اقبال اور اُن کے دوسرے ہم عصر مثلاً سید ابوالاعلیٰ مودودی اور سید قطب، وغیرہ نے موجودہ سیکولرزم کو سرے سے سمجھا ہی نہیں۔ اقبال سمیت یہ تمام لوگ ردعمل کی نفسیات کا شکار تھے۔

وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر مغرب کی ہر چیز سے متنفر تھے۔ اس لیے بغضک الشی یعمی ویصم کے اصول کے مطابق، وہ سیکولرزم کو کھلے ذہن کے ساتھ دیکھ نہ سکے۔ اس بنا پر وہ اُس کو سمجھنے سے عاجز رہے۔

جس طرح ہر فکری نظام میں کچھ انتہا پسند (extremists) ہوتے ہیں، اسی طرح سیکولرزم کے حلقہ میں بھی کچھ انتہا پسند قسم کے لوگ پیدا ہوئے۔ اس طرح کی انتہا پسندانہ تشریح کی بنا پر موجودہ زمانہ کے مسلم علماء اور دانشوروں نے سیکولرزم کا ترجمہ لادینیت کیا۔ مگر یہ ترجمہ صحیح نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اکثریت کی رائے کے مطابق، عملی طور پر جو سیکولرزم دنیا میں رائج ہوا وہ بلاشبہ ایک موافقِ دین نظریہ تھا، نہ کہ مخالفِ دین نظریہ۔

حقیقت یہ ہے کہ جدید سیکولرزم عملی طور پر اُسی قسم کا ایک بندوبست ہے جو پیغمبر اسلام کے زمانہ میں صُلح حدیبیہ کی صورت میں سامنے آیا۔ سیکولرزم کا مطلب سادہ طور پر صرف یہ ہے کہ اسٹیٹ مشترک قسم کے نیشنل معاملات کو چھوڑ کر مذہب اور کلچر کے معاملہ میں ناطرفداری (non-interference) کی

پالیسی اختیار کرے۔اس موضوع پر میں اپنی کتاب دین کامل میں تفصیل کے ساتھ لکھ چکا ہوں۔وہاں آپ ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

سوال

میرا ایک مسئلہ ہے جس نے مجھ کو بہت مغموم کر رکھا ہے۔ مسئلہ یوں ہے کہ بندہ بالوں کے گرنے کی پرابلم سے دوچار ہے۔ بال گرتے تو ہیں مگر دواؤں کے باوجود وہ دوبارہ نہیں اگتے۔ کیا رب العالمین اس پر قادر نہیں۔ کیوں ایسا ہے کہ خدا نے کسی کے سر پر خوبصورت بال دیے اور کسی کو گنجا بنا دیا۔ برائے مہربانی آپ اپنی رائے سے نوازیں۔ (عمر رفیق، سری نگر، کشمیر)

جواب

آپ کے جذبات قابل قدر ہیں۔ بال کے بارے میں جو کچھ آپ نے لکھا ہے، اُس کا جواب یہ ہے کہ موجودہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ یہاں ہر چیز آزمائش کے لیے ہوتی ہے، ملنا بھی اور نہ ملنا بھی۔ اسی طرح آدمی کے سر پر اچھے بال کا اُگنا بھی آزمائش ہے اور بال کا جھڑنا یا سفید ہونا بھی آزمائش۔ اس آزمائش میں پورا اترنا یہ ہے کہ آدمی دونوں حالتوں کو یکساں طور پر خدا کی طرف سے سمجھے، وہ ملنے پر نازاں نہ ہو اور نہ ملنا اُس کو مایوسی میں مبتلا نہ کرے۔ آپ بال کے مسئلہ کے بارے میں علاج کریں مگر کسی بھی حال میں مایوسی کا شکار نہ ہوں۔ بلکہ اللہ سے یہ دعا کریں کہ اے اللہ، میں تیرے فیصلہ پر راضی ہوں، تو میرے لیے حُسن تلافی کا فیصلہ فرما۔ مجھے آخرت میں جنت دے دے جہاں نہ کوئی بیماری ہوگی اور نہ کوئی محرومی۔

انسان کو خود سے دنیا میں کوئی مصیبت نہیں مانگنا چاہئے۔ لیکن اگر اُس پر کوئی مصیبت آجائے تو اُس وقت اُس کو کامل صبر کی روش اختیار کرنی چاہئے۔ یہی مومن کا طریقہ ہے اور یہی جنت کی قیمت ہے۔

سوال

میں نے اکثر مکان اور دکان میں یہ جملہ لکھا ہوا دیکھا ہے۔ براہ کرم اس کے بارے میں بتائیں۔ وہ جملہ یہ ہے "ھذا من فضلِ ربی" (یہ میرے خدا کا فضل ہے) یہ کوئی دعا ہے، حدیث

ہے، قرآن کی کوئی آیت ہے یا عربی مقولہ ہے؟۔ کیا اس طرح کی چیزیں گھروں اور دکانوں میں ٹانگنا چاہئے؟ مجھ کو تو ایسا لگتا ہے کہ ان سب چیزوں کو لٹکانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ وضاحت کریں۔ (شاہ عمران حسن، مونگیر)

جواب

مذکورہ قرآنی آیت جس طرح ادھوری شکل میں مکانوں اور دکانوں میں لکھی جاتی ہے اُس سے اُس کا اصل مفہوم واضح نہیں ہوتا۔ اصل یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے جو خصوصی طاقت عطا فرمائی تھی اُس کا ذکر کرتے ہوئے اُنہوں نے کہا: قالَ هذا من فضل ربي، ليبلُوني أاشكر امَ اكفر، ومن شكر فإنما يشكر لنفسه، ومَنْ كفر فإن ربي غني كريم (النمل ۴۰) یعنی اُنہوں نے کہا کہ یہ میرے رب کا فضل ہے۔ تا کہ وہ مجھے جانچے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری۔ اور جو شخص شکر کرے تو وہ اپنے ہی لیے شکر کرتا ہے۔ اور جو شخص ناشکری کرے تو میرا رب بے نیاز ہے، کرم کرنے والا ہے۔

اپنی دکانوں یا مکانوں میں جو لوگ هذا من فضل ربي لکھ کر لگاتے ہیں وہ اس طرح یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ دکان اور مکان جو اُنہیں ملا ہے وہ فضل اور انعام کے طور پر ملا ہے۔ حالانکہ پوری آیت کو سامنے رکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس قسم کی مادی چیزیں اللہ کی طرف سے جس کو دی جاتی ہیں وہ اُس کو بطور امتحان دی جاتی ہیں، نہ کہ بطور انعام۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی ہر چیز امتحان کا پرچہ ہے۔ جہاں تک انعام الٰہی کا تعلق ہے، وہ کسی مقبول انسان کو آخرت میں ملے گا، موجودہ دنیا میں نہیں۔ موجودہ دنیا ایک امتحان گاہ ہے اور یہاں کی ہر چیز کو امتحان کی مصلحت کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔

سوال

آج کے دور میں جب کہ وسائل (resources) کے نقطۂ نظر سے اہل یورپ و امریکہ مُسلم ممالک سے کئی گُنا زیادہ ترقی یافتہ ہیں، مسلمانوں کو یورپ و امریکہ کے خلاف قتال پر مبنی جہاد پر دھیان دینا چاہئے یا اپنی طاقت وقوت بڑھانے پر؟ (زبیر احمد، بھاگل پور)

جواب

قتال اسلام میں ایک مشروط حکم ہے، نہ کہ کوئی مطلق حکم۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ نماز روزہ کی طرح قتال بھی ہر حال میں جاری رکھنا ہے۔ قتال صرف اُس وقت کے لیے ہے جب کہ کسی خارجی طاقت کی جارحیت کی بنا پر دفاع کا مسئلہ پیدا ہو گیا ہو۔ اس دفاع کی بھی کئی لازمی شرطیں ہیں۔ اُن شرطوں کی تکمیل کے بغیر دفاعی قتال بھی جائز نہیں۔ اس معاملہ کی وضاحت اس سے پہلے الرسالہ میں آچکی ہے۔

جہاں تک اہل مغرب کا تعلق ہے، اُن کے مقابلہ میں ہمارا کام قتال نہیں ہے بلکہ دعوت ہے۔ عمومی طور پر سارے مسلمانوں کے لیے اور خصوصی طور پر یورپ اور امریکہ میں مقیم مسلمانوں کے لیے فرض کے درجہ میں لازم ہے کہ وہ تمام ضروری آداب وشرائط کے ساتھ اُن قوموں کو اسلام کا پیغام پہنچائیں۔ یہ دعوتی کام پوری طرح پُرامن انداز میں ہونا چاہئے۔ مؤثر دعوتی عمل کے لیے مسلمانوں پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ مسلم اور غیر مسلم کے درمیان وہ معتدل فضا قائم کریں جس کے اندر دعوت کا کام مطلوب انداز میں جاری ہو سکے۔

سوال

آپ نے ۱۹۹۳ میں بابری مسجد کے مسئلہ میں جو دو نکاتی فارمولا پیش کیا تھا وہ بلاشبہہ بہترین فارمولا تھا مگر اس کے اعلان کے لئے آپ نے صحیح وقت کا انتخاب نہیں کیا۔ ایک صحیح فارمولا غلط وقت کی وجہ سے وہ مقبولیت حاصل نہ کرسکا جس کی ضرورت تھی۔ (ایک قاری الرسالہ، ناگپور)

جواب

آپ کا یہ خیال درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس وقت میں نے اپنا یہ فارمولا پیش کیا وہی اس کو پیش کرنے کا موزوں ترین وقت تھا۔ اس قسم کے نازک اشو وقت گزرنے کے ساتھ پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس لئے اس قسم کے کسی مسئلہ پر اس کے عملی حل کا فارمولا پیش کرنے کا سب سے زیادہ صحیح وقت وہی ہوتا ہے جب کہ مسئلہ کا آغاز ہوا ہو۔ اس معاملہ میں دیر کرنا گویا کہ کام کے اصل موقع کو کھو دینا ہے۔

اس کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ بابری مسجد کے حادثہ (٦ دسمبر ۲۰۰۲) پر دس سال گزر چکے ہیں اور ابھی بھی اس معاملہ میں کوئی مسلمان حقیقت پسندانہ فارمولا سننے کے لئے تیار نہیں۔ اگر ۱۹۹۲ میں یہ فارمولا قبل از وقت تھا تو اب ۲۰۰۲ میں اُس کو بروقت ہو جانا چاہئے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اب بھی کوئی لیڈر اُس کو پیش کرنے کے لیے سامنے نہ آسکا۔ اصل یہ ہے کہ اس قسم کے اختلافی مسائل وقت گزرنے کے بعد ہمیشہ ساکھ کا مسئلہ (prestige issue) بن جاتے ہیں۔ اس لئے بہترین پالیسی یہ ہے کہ ساکھ کا مسئلہ بننے سے پہلے اس کو حل کیا جائے۔ کیوں کہ ساکھ کا مسئلہ بننے کے بعد وہ حل ہونے والے ہی نہیں۔

ایجنسی الرسالہ

الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔ الرسالہ (اردو) کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی، انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد والی ایجنسی کے لئے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ یا دو تین ماہ بعد اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینے میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زر تعاون الرسالہ

ہندستان کے لئے		بیرونی ممالک کے لئے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs. 110	ایک سال	$20/£10	$10/£5
دو سال	Rs. 200	دو سال	$35/£18	$18.£8
تین سال	Rs. 300	تین سال	$50/£25	$25/£12
پانچ سال	Rs. 480	پانچ سال	$80/£40	$40/£18